ستمبر ۲۰۱۵ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

عزت مآب وزیر اعلیٰ

عالی جناب نتیش کمار

صدر، بہار اردو اکادمی

معزز وزیر اقلیتی فلاح

عالی جناب نوشاد عالم

کارگزار صدر، بہار اردو اکادمی

نائب صدور

جناب سلطان اختر

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد

مدیر

مشتاق احمد نوری

سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر

انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۳۶ شمارہ : ۹

ستمبر ۲۰۱۵ء

زرتعاون : دس روپے

سالانہ : سو روپے

''زبان وادب''میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476

Web : www.biharurduacademy.org

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز	مدیر	۳
مقالات	برقی مواصلاتی نظام اور اردو زبان	انجم عثمانی	۵
	افسانہ ''گرہن'' کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر پرویز شہریار	۱۲
	اکیسویں صدی میں بہار کے اردو ناول	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	۱۸
	زبان و بیان کا جادوگر: کرشن چندر	ڈاکٹر قیام نیر	۲۵
افسانے	ساعتوں کا چور	حسین الحق	۲۸
	ساتواں منطقہ	ڈاکٹر کوثر جمال	۳۷
	ایک گزرا ہوا کل	یوسف عزیز زاہد	۴۲
	یک بوسہ شیریں	منزہ احتشام گوندل	۴۵
	ہم نفس	صدف احمد زبیری	۴۹
	الگ صوبہ	آنند لہر	۵۲
منظومات	دیر سویر تو ہو جاتی ہے / احساس	الماس شبی	۵۴
	کیا غلط ہے......؟ / منزلوں کے خواب	سید تحسین گیلانی / رئیس الدین رئیس	۵۵
	آزادی کا سکھ / ملال	اسماعیل پرواز / ایم۔نصر اللہ	۵۶
	برگد کچھ تو بول	سلیم شہزاد	۵۷
	آدمِ اصغر / عازمین حج کے نام	اختر کاظمی / ارشد قمر	۵۸
	غزلیں	پروفیسر مظفر حنفی / محمد یعقوب آسی	۵۹
	غزلیں	ڈاکٹر نثار احمد / تسلیم الٰہی زلفی	۶۰
	غزلیں	فرحت ندیم ہمایوں/حبیب الرحمٰن مشتاق	۶۱
	غزلیں	مہر افروز / علی قسور خلیق	۶۲
	غزلیں	عرش صہبائی / اشرف یعقوبی	۶۳
	غزلیں	شاہد اختر / ظفر صدیقی	۶۴
کتابوں کی دنیا	دہلی کے ۵۰ صحافی — ظفر انور	مبصر : ڈاکٹر شائستہ انجم نوری	۶۵
	تحفۂ پاکیزہ — صبا نقوی	مبصر : محمد شوکت جمال	۶۷
خبریں	بہار اردو اکادمی: نئی مجلس عاملہ کی تشکیل		۶۹
	اردو لرننگ کورس کے طلبا و طالبات کے درمیان تقسیم اسناد		
	یوم آزادی کے موقع پر تقریب پرچم کشائی		
سلام و پیام	قارئین کے خطوط	......	۷۰

بچوں کا زبان وادب

۷۳ —— ۸۰

اداریہ

حرف آغاز

ستمبر کا شمارہ حاضر ہے۔ اگر اس میں آپ نے خوشگوار تبدیلی محسوس کی، تو میں سمجھوں گا کہ ''زبان وادب'' ترقی کی جانب گامزن ہے۔ میری کوشش رہی ہے کہ آپ کی خدمت میں معیاری ادب پیش کروں۔ معیار کی ذمہ داری صرف ایڈیٹر پر نہیں آتی ہے بلکہ معیار کا تعین تخلیق سے ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ پوری اردو دنیا کے قلم کاروں نے میری آواز پر لبیک کہا اور انہوں نے اپنی تخلیقات فوری طور پر بھیج کر مجھے سرخرو ہونے کا موقع عنایت کیا۔

اس بار کے مضامین دیگر شماروں سے مختلف ہیں۔ انجم عثمانی نے ''برقی مواصلاتی نظام اور اردو زبان'' کے تحت بہت ہی عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ ترسیل کے تعلق سے یہ مضمون یاد رکھنے لائق ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس سے محظوظ ہوں گے۔ ستمبر کا مہینہ راجندر سنگھ بیدی کی ولادت کا مہینہ ہے۔ ان کے خراج کے طور پر ڈاکٹر پرویز شہریار کا مضمون ''گرہن کا تنقیدی جائزہ'' شامل کیا گیا ہے۔ پرویز شہریار نے ان کے افسانہ ''گرہن'' کو کئی نہج سے کھولنے کی کوشش کی ہے جس سے بیدی کا فن بھی آشکار ہو جاتا ہے۔ شہاب ظفر اعظمی نے ''اکیسویں صدی میں بہار کے اردو ناول'' پر اپنی گفتگو پھیلائی ہے۔ بہار نے ہر دور میں فکشن کی نمائندگی کی ہے۔ شہاب ظفر اعظمی نے ان سارے ناولوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک عمدہ مضمون قلمبند کیا ہے۔ کرشن چندر کو زبان و بیان کا جادوگر کہا جاتا ہے، لیکن فی زمانہ ان پر بہت کم بات ہوئی ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے اور کرشن چندر کے زبان و بیان پر ایسا مضمون تحریر کیا ہے کہ کرشن چندر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

اس بار ''زبان وادب'' میں کافی عمدہ کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ حسین الحق کی کہانی ''ساعتوں کا چور'' آج کے سیاسی تناظر میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کہانی دھیرے دھیرے کھلتی ہے۔ ابھی جو سیاسی پس منظر ہے جس سے اقلیتوں کے اندر ایک خوف طاری ہے، اقلیت کے اس خوف کو حسین الحق نے بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ انسانی جبلت یہ ہے کہ جب وہ کسی خوف میں مبتلا ہوتا ہے تو بہت سارے خوف اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذہن میں طاری ہونے لگتے ہیں اور بہت بڑے تناظر میں وہ چھوٹے چھوٹے سے مسئلہ کو بھی دیکھنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کہانی میں ضمنی طور پر خوف کے بہت سارے دروازے ایک ساتھ کھل جاتے ہیں اور اس کے درمیان پورا اقلیتی طبقہ سہا سہا نظر آتا ہے۔ میں ڈاکٹر کوثر جمال کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے میری فرمائش پر آدھے گھنٹے کے اندر اپنی کہانی مجھے میل کر دی۔ کوثر جمال آسٹریلیا میں رہتی ہیں، لیکن پوری اردو دنیا میں ان کی کہانیوں کی دھوم ہے۔ یہ کہانی ''ساتواں منطقہ'' دو محبت کرنے والوں کی کہانی ہے اور یہ اتنے خوبصورت انداز میں پروان چڑھتی ہے کہ آپ داد دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ روشن بیانیہ کی ایک عمدہ مثال کے طور پر یہ کہانی یاد رکھی جائے گی۔ یوسف عزیز زاہد کی کہانی ''ایک گزرا ہوا کل'' واقعی گزرے ہوئے کل کی کہانی ہے، اس میں تھوڑا سا سسپنس ہے، لیکن قاری کہانی کے ساتھ ساتھ یوں چلتا ہے جیسے یہ اسی کی کہانی ہو۔ منزہ احتشام گوندل نئی نسل کی ایک نمائندہ کہانی کار ہیں۔ یہ بہت اچھی شاعرہ بھی ہیں۔ ساتھ ہی ان کی تنقیدی جہت بھی کافی متاثر کرتی ہے۔ منزہ نے میری فرمائش پر خصوصی طور پر کئی تخلیقات ایک ساتھ بھیج دی ہیں جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ ''یک بوسہ شیریں'' رومانس پر مبنی کہانی تو لگتی ہے، لیکن منزہ نے انسانی نفسیات کو جس خوبصورتی سے اُبھارا ہے یہ انہیں کا حصہ ہے۔ کہانی پڑھنے کے بعد آپ کو احساس ہوگا کہ منزہ نے نفسیاتی طور پر آپ کے دل میں ایک تیر ترازو کر دیا ہے۔ صدف احمد زبیری عمان میں رہتی ہیں۔ ان کی کہانی ''ہم نفس'' ایک جوڑے کی نفسیاتی الجھن کی عمدہ عکاسی کرتی ہے، ہر عورت اپنے شوہر سے پیار کی متلاشی ہوتی ہے، اس کے لئے اسے کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اسے آپ ''ہم نفس'' میں دیکھ سکیں گے۔ صدف نے دونوں کیرکٹر کی کردار سازی میں بہت محنت کی ہے۔ آنند لہر، پرانے لکھنے والے ہیں ان کی کہانی ''الگ صوبہ'' اس لئے یاد رکھی جائے گی کہ انہوں نے جانوروں کے ذریعہ انسانی کرداروں کا مضحکہ اڑایا ہے۔ اسے آپ ایک طنزیہ کہانی بھی کہہ سکتے ہیں۔ انسان اپنے کردار کے اعتبار سے کس طرح پستی کی جانب گامزن ہے،

اسے آنند لہر نے بہت خوبصورتی سے محسوس کرایا ہے۔ کچھ کہانیوں کے سلسلہ میں سوشل سائٹ اردو افسانہ فورم اور عالمی افسانہ فورم کے تعاون کا شکر گزار ہوں۔

منظوم حصے میں الماس شبیؔ کی دو نظمیں پیش ہیں۔ وہ امریکہ میں ریڈیو سروس سے منسلک ہیں، الماس بہت عمدہ شاعری کرتی ہیں، غزلیں بھی کہتی ہیں اور ریڈیو پر بہت خوبصورتی سے پروگرام بھی پیش کرتی ہیں۔ انہوں نے میری فرمائش پر کئی نظمیں اور غزلیں بھیجی ہیں جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ یہ دونوں نظمیں آپ کو متاثر کریں گی، اس کا مجھے یقین ہے۔ سید تحسین گیلانی نے میری گزارش پر ساؤتھ افریقہ سے اپنی کافی چیزیں بھیجی ہیں فی الحال ان کی ایک نظم یہاں پیش ہے۔ تنقید میں بھی ان کا بہت نام ہے اور متن کے اندر اترنے کا انہیں ہنر معلوم ہے۔ رئیس الدین رئیسؔ ایک پرانے شاعر ہیں جن سے آپ پہلے سے واقف ہیں، ان کی یہ نظم آپ کو ضرور متاثر کرے گی۔ اسماعیل پروازؔ اور ایم نصر اللہ کا تعلق سرزمین بنگال سے ہے۔ پروازؔ نے بنگلہ نظم کا بہتر ترجمہ پیش کیا ہے اور نصر اللہ کی نظم ''ملال'' بھی متاثر کرتی ہے۔ سلیم شہزاد پاکستان کے نوجوان شاعر ہیں۔ میری گزارش پر انہوں نے اپنی کئی نظمیں بھیجی ہیں۔ ''برگد کچھ تو بول'' حاضر خدمت ہے۔ یہ نظم بھی آپ کو متاثر کرے گی۔ اخترؔ کاظمی اور ارشد قمرؔ کی نظمیں بھی پیش ہیں، میں امید کرتا ہوں کہ آپ انہیں پسند کریں گے۔

غزلوں کا حصہ اس بار کافی جامع ہے۔ زیادہ تر چیزیں باہر سے میں نے منگوائی ہیں، اس سلسلے میں الماس شبیؔ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری فرمائش پر بہت سے شعرا کو ''زبان وادب'' کے لئے اپنی غزلیں بھیجنے کی دعوت دی۔ باہر کی ساری غزلیں انہیں کی محبت کا نتیجہ ہیں۔ مظفر حنفی کا نام محتاج تعارف نہیں، ان کی خوبصورت غزل، ان کے لب ولہجہ سے روشناس کرانے میں کامیاب ہے۔ محمد یعقوب آسی، ڈاکٹر نثار احمد، تسلیم الٰہی زلفی، حبیب الرحمٰن مشتاق، اور علی قسور خلیق کا تعلق پاکستان سے ہے، ان کی غزلیں ان کے تعارف کے لئے کافی ہیں۔ یہ سارے لوگ اپنے آپ میں ایک انجمن کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فرحت ندیم ہمایوںؔ نے نیویارک سے اپنی غزلوں سے نوازا ہے، ان کی یہ خوبصورت غزل آپ کو بھی متاثر کرے گی۔ مہر افروز اچھی کہانیاں لکھتی ہیں ساتھ ہی غزلوں اور نظموں میں بھی انہوں نے اپنے آپ کو منوالیا ہے۔ انہوں نے میری فرمائش پر اپنی کئی چیزیں بھیجی ہیں، ان کی یہ غزل ایک حالیہ واقعہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ عرشؔ صہبائی، اشرف یعقوبی، شاہد اخترؔ اور ظفرؔ صدیقی منجھے ہوئے غزل گو ہیں ان کی شاعری اس بات کی گواہ ہے کہ انہوں نے شعر کہنے میں اپنے خون جگر کا استعمال کیا ہے، تبھی ان کے اشعار میں نکھار پیدا ہوا ہے۔ تبصرے کے ضمن میں دو کتابوں پر تبصرہ ہے ظفر انور کی کتاب پر ڈاکٹر شائستہ انجم نوری نے اور صباؔ نقوی کی کتاب پر محمد شوکت جمال نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

''بچوں کا زبان وادب'' بزرگ شعرا ناوکؔ حمزہ پوری اور قیصرؔ صدیقی کی نظموں سے شروع ہوتا ہے۔ غزالہ پرویز، معروف پاکستانی ادیبہ ہیں اور انہوں نے بچوں کے لئے ہماری فرمائش پر کہانی ''کوا قوم کے نام'' بھیجی ہے جس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ ''عید قرباں کا پیغام'' شرف الہدیٰ کے قلم سے اور ''اردو'' پر نظم ثناء اللہ ثناؔ دوگھروی کے قلم سے ہے۔ پرویز اشرفی نے بچوں کے لئے ''پیغام'' کا تحفہ لایا ہے اور ماریہ نسیم ان کے لئے ''عبدالکلام کی انمول باتیں'' لے کر آئی ہیں۔ خالد رحیم اور کرشن پرویز نے ناصحانہ اور دعائیہ نظم بچوں کے لئے لکھی ہے۔ یقین ہے کہ یہ سب کچھ بچوں کو پسند آئے گا اور انہیں ذہنی تربیت ملے گی۔

ابھی محترم وزیر اعلیٰ نتیش کمار نے اردو اکادمی کی تشکیل نو کی ہے جس میں مجھے سکریٹری کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ میری یہ کوشش ہے کہ اکادمی کو پوری طرح فعال بنا دوں، اس ضمن میں میں نے کاموں کی شروعات بھی کر دی ہے۔ میری کوشش ہوگی کہ اردو اکادمی کے پروگرام ہر ضلع میں کئے جائیں اور اس ضلع کے بزرگ ادبا و شعرا کو انہیں کی سرزمین میں جا کر نوازا جائے۔ اس طرح اکادمی گھر گھر پہونچ کر ادب اور ادیب کو نوازنے کا کام کرے گی۔ صحافت کے سلسلے میں بھی پیش رفت ہوئی ہے۔ بہار میں صحافت کے معیار کو بلند کرنے کے لئے مشہور صحافیوں پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل دی گئی ہے جن کے مشورے سے کئی تربیتی کورس چلائے جائیں گے اور صحافیوں کی ایک باوقار نسل ہمارے سامنے آسکے گی اور بھی بہت سارے پروگرام ہیں جن کی تفصیل گاہے بگاہے پیش کی جاتی رہے گی۔

''زبان وادب'' کے اس شمارے پر مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا جس کی روشنی میں آگے کی منزل طے کرنے میں آسانی ہوگی۔

—— مشتاق احمد نوری

مقالات

انجم عثمانی

19/975, Lodhi Colony, New Delhi 110003

برقی مواصلاتی نظام اور اردو زبان

زندہ زبانیں ان زندہ قوموں کی علامت ہیں جن قوموں کی تہذیب و ثقافت سے انسانیت متاثر ہوتی ہے۔ زبانیں بھی جذبات، احساسات اور خیالات کی ترسیل کا مہذب طریقہ اور وسیلہ ہیں، اسی لیے زبان جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوگی ثقافت و تہذیب بھی اتنی ہی ترقی یافتہ اور مہذب ہوگی۔

ترسیل یعنی اپنی بات دوسروں تک پہنچانا یوں تو فطرت میں شامل ہے مگر ترسیل کے ذرائع انسانی زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

عوامی ذرائع ابلاغ و ترسیل کی مختلف صورتیں اتنی ہی پرانی ہیں جتنا خود انسانی سماج۔ غرض یہ کہ ترسیل ایک سماجی، جذباتی، معاشی و معاشرتی ضرورت ہے جس کے طریقوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، لیکن کمیونی کیشن نے موجودہ دور میں اس قدر اہمیت اختیار کر لی ہے کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے اچھوتا نہیں رہا۔

عوامی ترسیل

لفظ کمیونی کیشن (Communication) لاطینی زبان کے لفظ کومینس (Communiss) سے ماخوذ ہے جس کے معنی اشتراک (Sharing) ہوتے ہیں۔ کمیونی کیشن میں بھی کیونکہ خیالات کا تبادلہ ہوتا ہے اور ایک دوسرے کی سوچ میں شرکت ہوتی ہے، اس لیے اس لفظ کو عالمی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

ترسیل صرف بات کہہ دینا (چاہے وہ تصویری ہو، زبانی ہو یا عمل و حرکت کے ذریعے) ہی نہیں ہے بلکہ بات کا پہنچنا بھی ضروری ہے۔ جہاں بات دوسرے تک نہ پہنچ پائے وہاں ترسیل نہیں ہوگی، گویا ترسیل کے لیے مرسل اِلیہ بھی ضروری ہے اس طرح ترسیل ایک مشترکہ عمل ہے اور یہ جذبات و خیالات اور احساسات کی ترسیل سے لے کر لفظوں کی ترسیل تک سب پر صادق آتا ہے۔ ترسیل اپنے مکمل معانی میں دراصل متاثر کرنے اور متاثر ہونے کا عمل ہے۔

ترسیل صرف انسان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ حیوان، نباتات و جمادات بھی اپنی اپنی فطری زبانوں اور فطری ذرائع سے ترسیل کرتے ہیں، مگر انسان کے لیے ترسیل کا عمل باقاعدہ ایک سماجی عمل ہے اور ترسیل کے بغیر ہم اپنی زندگی کی بیشتر ضروریات پوری نہیں کر سکتے۔

ترسیل صرف لفظوں، آوازوں اور تصویروں تک ہی محدود نہیں، اس کے ان گنت طریقے ہو سکتے ہیں۔ مثلاً آپ کسی چھوٹے بچے کے سامنے جھنجھنا بجاتے ہیں بچہ مسکراتا ہے، آپ کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ اس طرح آپ اور بچہ ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ آپ کے اور اس کے درمیان ترسیل کا عمل قائم ہو جاتا ہے۔ کلاس روم میں بچہ استاد کو انگلی دکھاتا ہے، استاد جانتا ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے، وہ گردن ہلا کر اجازت دیتا ہے۔ گویا اشارہ بھی ترسیلی عمل ہے۔

ریڈیو کا براڈ کاسٹ یا ٹی وی کا ٹیلی کاسٹ ٹرانسمیٹر کے ذریعے اپنی بات آپ تک پہنچاتا ہے آپ اس بات کی سنتے ہیں، دیکھتے ہیں، یہ بھی ترسیل ہے۔

عمل ترسیل

عمل ترسیل کے تین بنیادی اجزا ہیں:

مرسل (Sender)

مرسل الیہ (Receiver) اور

پیغام (Message)

نشریاتی صورت حال میں (Broadcasting, Telecasting

(Situation) بات کہنے والا ٹرانسمیٹر کے ذریعے صوتی (Sound) تصویری (Visual) یا صوتی و تصویری (Audiovisual) کے طور پر اپنی بات پہنچاتا ہے۔ آپ اس کو سنتے، دیکھتے اور متاثر ہوتے ہیں۔ اس صورت حال میں ترسیل کے بنیادی عناصر پانچ ہوتے ہیں جو ترسیل کے دائرے کو مکمل کرتے ہیں۔

دائرہ ترسیل

ذریعے...... پیغام/بات/مقصد......وسیلہ

Sources Message Medium

سامع/ناظر......ردعمل (Audience/ Feedback)

گزشتہ سطور میں میں نے عرض کیا تھا کہ ترسیل اپنے مکمل معنی میں متاثر ہونے اور متاثر کرنے کا عمل ہے۔ آمنے سامنے، سننے سنانے یا تحریری طور پر مخاطب ہونے سے متاثر ہونے یا نہ ہونے کا علم ہو جاتا ہے، مگر نشریاتی صورت حال میں یہ عمل یک طرفہ لگتا ہے، یعنی آپ سن کر یا دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں، مگر آپ کا ردعمل فوری طور پر مرسل تک نہیں پہنچ پاتا، اس کے لیے نشریاتی اداروں نے باقاعدہ شعبے قائم کر رکھے ہیں جو مختلف طریقوں سے ردعمل کی رپورٹ تیار کرتے ہیں اور ان رپورٹوں سے جو رائے مرسل تک پہنچتی ہے، اس کی بنیاد پر مستقبل کا لائحہ عمل طے ہوتا ہے ذرائع ترسیل (خاص طور پر ریڈیو اور ٹی وی) کے تجارتی ذریعہ بن جانے کے بعد اب اشتہارات کی تعداد اور قیمت ردعمل کا معتبر ذریعہ مانا جانے لگا ہے۔ گویا نشریاتی ادارے متاثر کرتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں اور دائرہ ترسیل کو مکمل کرتے ہیں۔

کب، کہاں، کیا، کس نے، کس ذریعے سے کہا اور اس کا کیا اثر ہوا؟ یہ اور اس طرح کے سوالات ترسیل کی دنیا میں بہت اہمیت رکھتے ہیں، اسی لیے ان اجزا کو دائرہ ترسیل اپنے احاطہ عمل میں لاتا ہے اور ان کے جوابات تلاش کرنے کا عمل ترسیل کا نتیجہ ہے۔ موثر اور کامیاب ترسیل کے لیے سامعین/ناظرین کے مزاج، رسم و رواج، تہذیب و ثقافت، ماحول، ضروریات اور معاشی و معاشرتی صورت حال وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل ہونا ضروری ہے۔

ایک مثالی کمیونی کیٹر کے لیے حالات سے باخبری کے ساتھ ساتھ آڈینس کی سماجی زندگی، عادات و اطوار، مجموعی خصوصیات وغیرہ کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں جاننا ضروری ہے، اس لیے کہ اگر خوبصورت متاثر کن طریقے سے وہ من لگتی بات نہیں کہہ رہا ہے تو اس کو دیکھنے، سننے والے رد کر دیتے ہیں (سوئچ آف کر دیتے ہیں) اور ترسیل کا عمل ادھورا رہ جاتا ہے اور مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ سو فی صد وہی کہا جائے جو لوگ چاہتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ وہ سب کو اپنا سا لگے اور وہ اس سے متاثر ہوں۔

عوامی ترسیل ایک سماجی عمل ہے اور فی زمانہ ترسیل کے ذرائع اتنے پھیل گئے ہیں کہ منفی اور مثبت دونوں طرح کے اثرات بڑے پیمانے پر مرتب ہوتے ہیں، اس لیے کمیونی کیٹر کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ یہاں زبان سے جو بات نکلتی ہے صرف کوٹھوں ہی نہیں چڑھتی بلکہ فضاؤں میں رچ بس جاتی ہے جو پورے ماحول کو متاثر کرتی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ذرائع ترسیل و ابلاغ کا استعمال انسانی فلاح و بہبود، تہذیب و تمدن کی بقا اور مثبت اقدار کے فروغ کے لیے کیا جائے تاکہ یہ ترقی رحمت ثابت ہو، زحمت نہ بن جائے۔ مناسب ہوگا کہ برقیاتی نظام ترسیل کی اہم ایجادات کو ایک نظر دیکھ لیں۔

برقیاتی مواصلاتی نظام ۱۸۴۴ء میں ٹیلی گراف لائن کی ایجاد سے قائم ہوا۔ اس کا موجد مورس ہے جس نے امریکہ میں پہلی بار کامیابی کے ساتھ ٹیلی گراف لائن کا استعمال کیا۔ اس کے بعد اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوئے اور امریکی شہریت اختیار کرنے والے گراہم بیل نے ۱۸۷۶ء میں ٹیلی فون اور پھر ۱۹۰۶ء میں ریڈیو ایجاد کیا۔ ریڈیو کا موجد مارکونی اطالوی نژاد تھا۔ ریڈیو کی ایجاد اور براڈ کاسٹنگ اسٹیشنوں کے قیام نے برقی مواصلاتی نظام کو آگے بڑھایا اور اس کے بعد ترقی کی وہ ساری راہیں روشن ہوئیں جن پر چل کر موجودہ برقی مواصلاتی نظام موجودہ ترقی یافتہ شکل تک پہنچ سکا ہے۔

ہندوستان میں ریڈیو نشریات

ہندوستان میں نشریات کی تاریخ پر نظر ڈالتے وقت یہ خیال رہنا چاہئے کہ آزادی ہند سے پہلے مختلف محکموں اور اداروں کے توسط سے

ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آچکا تھا اور محدود پیمانے پر ہی سہی نشریات جاری تھیں۔ آزادی کے بعد حکومت ہند کی جانب سے چلائے جانے والے ریڈیو اسٹیشن کو 'آل انڈیا ریڈیو' کا نام دیا گیا اور مختلف مقامی نشریاتی اداروں کو اس میں ضم کردیا گیا۔

ہندوستان میں ریڈیو نشریاتی تاریخ

اگست ۱۹۲۱ء میں ٹائمز آف انڈیا اور ڈاک تار محکمے نے ممبئی میں نشریات کا آغاز کیا۔ ۱۶، مئی ۱۹۲۴ء کو مدراس پریسیڈنسی (Presidency) ریڈیو قائم ہوا اور جولائی سے روزانہ نشریات شروع کیں۔ ۱۹۲۶ء میں انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی (IBC) کا قیام عمل میں آیا اور اس نے حکومت کے ساتھ معاہدہ کیا۔ ۱۹۲۷ء کو IBC ممبئی سے باقاعدہ نشریات کا آغاز ہوا۔ یکم جنوری ۱۹۳۶ء سے دہلی میں انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس (Indian State Broad Casting Service) کی نشریات کا آغاز ہوا۔ ۸/جون ۱۹۳۶ء کو IBC کو آل انڈیا ریڈیو (AIR) کا نام دیا گیا۔ ۹/جون ۱۹۳۶ء کو دلی ریڈیو اسٹیشن ڈائریکٹر اے ایس بخاری نے کنٹرولر کی حیثیت سے کام سنبھالا۔ ۱۶، دسمبر ۱۹۳۷ء کو AIR لاہور اسٹیشن کا قیام ہوا۔ ۱۶، دسمبر ۱۹۳۹ء کو AIR ڈھاکہ اسٹیشن بنا۔ ۳/جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن (Lord Mount Batton) محمد علی جناح، جواہر لال نہرو اور سردار بلدیو سنگھ نے تقسیم ہند سے متعلق تقاریر نشر کیں۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء کے دہے میں بہت سے ریڈیو اسٹیشن قائم کیے گئے۔ ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ء کو نوجوانوں کے علاوہ نشریات پودانی شروع ہوا اور ۱۹۶۹ء میں ہی کمرشیل سروس شروع کی گئی۔

اردو اور ریڈیو: ہندوستان میں

ہندوستان میں ریڈیو کے نقطہ آغاز سے آج تک اردو زبان نے اس میڈیم کی ترقی اور ترویج میں اپنا مثبت کردار ادا کیا ہے۔ جہاں یہ سچ ہے کہ نشریات کے ذرائع کی ایجادات نے زبانوں اور ان سے وابستہ چیزوں کو دور دور تک پھیلا دیا ہے، وہاں یہ بھی سچ ہے کہ زبان یعنی لفظ و معانی کے بغیر نشریات کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

عوامی ذرائع ابلاغ کی اپنی زبان ضرور ہوتی ہے، مگر ان کی بنیاد بھی وہی زبان ہوتی ہے جسے عوام بولتے، سمجھتے ہیں اور جس میں اپنے جذبات و خیالات کا اظہار آسانی سے کرتے ہیں۔ اردو کیوں کہ اپنے مزاج کے اعتبار سے فطری طور پر لچک دار اور ترسیلی خصوصیات کی حامل ہے، اس لیے ریڈیو نے شروع سے ہی اس سے نہ صرف تقویت حاصل کی بلکہ آج بھی ہندی اردو علاقوں میں اردو کی بدولت ریڈیو زندہ ہے۔ اردو کے فلمی گانوں، قوالیوں، غزلوں، گیتوں، ڈراموں اور شعر و ادب کے بغیر کسی معیاری ریڈیو نشریات کا تصور آج بھی کم از کم شمالی ہندوستان میں ممکن نہیں ہے۔

اردو زبان نشریات کے لیے پہلے بھی ناگریز تھی، آج بھی ناگریز ہے اور ریڈیو نشریات کی مقبولیت کا بڑا سبب ہے۔

ہندوستانی فلمیں اور اردو

برقی مواصلاتی نظام میں، فیچر فلم ٹی وی کے عام ہونے سے پہلے غالباً سب سے زیادہ مقبول سلسلہ تھا۔ ٹیلی ویژن کے گھر گھر پہنچنے اور دوسری کئی وجوہات مثلاً بے پناہ مصروفیت اور روز کے معمولات میں رفتار کی تیزی وغیرہ نے گرچہ سینما ہال میں جانے کی عادتوں کو متاثر کیا ہے، مگر فلم کی مقبولیت آج بھی برقرار ہے اور اس کی اہمیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں۔

فلم اور اردو کا تعلق شروع سے ہی بہت مستحکم رہا ہے۔ بالی ووڈ کی بیشتر فلمیں آج بھی اردو زبان کے بغیر مقبولیت حاصل نہیں کرسکتیں اور فلمی نغمے تو بغیر اردو شاعری کے فلم میں جگہ ہی نہیں پاسکتے۔

ہندوستانی فلموں میں اردو کے کردار کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ہندوستان میں فلموں کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈال لیجیے۔

ہندوستان میں سنیما نے اپنا سفر ۱۸۹۶ء میں ممبئی میں شروع کیا۔ ۷/جولائی ۱۸۹۶ء کو ممبئی کے واٹسن ہوٹل میں پہلی مختصر فلم کی نمائش عمل میں آئی۔ اسے ممبئی لانے کا سہرا فرانس کے لومیئر برادران کے سر ہے۔ یہ لوگ اس سے ایک سال قبل فرانس میں اس انوکھی دریافت کی نمائش کرچکے تھے۔

۱۸۹۶ء میں ممبئی میں مختصر فلم کی نمائش کے بعد عوام کا فلم بینی کا ذوق بڑھا چنانچہ جب ۱۹۱۲ء میں آر جی ٹورنی (R.G.Torney) کی فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی تو لوگوں نے اسے بہت سراہا۔

۳؍مئی ۱۹۱۳ء کو پہلی ہندوستانی مکمل فلم ''راجہ ہریش چندر'' دادا صاحب پھالکے نے پیش کی جو باکس آفس پر بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ اس کے بعد بہت سے لوگوں نے اس صنعت میں دلچسپی لی، یہاں تک کہ ۱۹۳۱ء میں اردشیران کی امپیریل فلم کمپنی نے پہلی متکلم فلم ''عالم آرا'' پیش کر کے خاموش فلموں کے دور سے ہندوستانی فلم کو بولتی فلموں کے دور میں داخل کر دیا، حالانکہ خاموش فلموں کا دور ۱۹۳۴ء تک جاری رہا، مگر آہستہ آہستہ ناظرین نے متکلم فلموں کو مکمل طور پر اپنا لیا اور خاموش فلمیں تاریخ کا حصہ بن گئیں۔

ہندوستانی فلموں کی تاریخ گواہ ہے کہ پہلی متکلم فلم سے موجودہ دور کی فلموں تک اردو زبان اور زبان کے متعلقات یعنی زبان سے وابستہ تہذیب، ثقافت اور شعر و ادب نے فلموں کی مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا ہے اور اردو شعر و ادب سے وابستہ بہت سے معتبر نام فلم سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ فلم کیونکہ بنیادی طور پر اسٹیج ڈرامے سے متاثر تھی اور آغاز میں فلم کا اسٹرکچر پوری طرح اسٹیج سے متاثر تھا اس لیے بھی زبان کو فلم میں بنیادی طور پر عمل دخل حاصل تھا۔ تاریخی طور پر اردو تھیٹر کی زبان تھی اور تھیٹر عوامی سطح پر زبان کی مقبولیت سے پورا فائدہ حاصل کر رہے تھے اور یہی تھیٹر کے لوگ جیسے جیسے فلم میں منتقل ہوئے تو اپنا مزاج بھی ساتھ لائے جو ظاہر ہے اردو کا مزاج تھا۔ آغا حشر کے ڈراموں سے لے کر اپٹا کے ڈراموں تک کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اردو نے وہاں بھی اپنا عوامی کردار ادا کیا تھا اور یہاں فلموں میں بھی اپنا عوامی کردار ادا کر رہی ہے۔

بالی ووڈ کی فلموں میں اردو ادب اور شعر نے آج بھی اپنا اثر بنا رکھا ہے اور تمام تر حالات کے باوجود اردو زبان و ادب آج فلموں کے لیے ناگریز ہے۔ گرچہ اردو رسم خط سے واقفیت رکھنے والوں کی تعداد میں کمی آئی ہے مگر زبان اور خاص طور پر نغموں کے ذریعے شاعری نے فروغ پایا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ صرف زبان جاننے کی بنیاد پر فلم پر دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ زبان کے بغیر فلم مقبول بھی نہیں ہو سکتی۔

فلموں کی مقبولیت کا دارومدار ظاہر ہے کہ عوامی پسند پر منحصر ہے اور عوام کو سب سے پہلے جو چیز فلم کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ہے فلمی نغمہ اور فلمی گانے اور چونکہ یہ عام طور پر اردو میں ہوتے ہیں اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو کو یہ اولیت حاصل ہے کہ اس کی شاعری موسیقی کے ساتھ مل کر عوام کو سنیما گھروں تک کھینچ لاتی ہے اور اس کے بعد اردو کے مکالمے اس کی مقبولیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ اردو زبان پہلے بھی فلموں کی جان تھی اور آج بھی اس زبان کے بغیر فلم کی مقبولیت ممکن نہیں ہے۔

ٹیلی ویژن اور ہندوستان

ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی عمر اب چھ دہائیوں سے زیادہ ہو چکی ہے۔ ان برسوں میں ترسیل و ابلاغ کے اس جدید ذریعے نے ہمارے ملک میں کئی ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں زیادہ ترقی اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ ارتقا تکنیکی اعتبار سے بھی ہوا ہے اور پیش کش و مواد کے اعتبار سے بھی، یہ بات اور کہ اس ذریعہ کی رفتار ترقی اتنی تیز ہے کہ جتنا اس پر قابو پایا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ یہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قوت و اثر کو پہچاننے میں تھوڑا وقت لگا اور شروع کے پندرہ بیس برسوں میں ترقی سست تھی، مگر اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ٹی وی سیٹس بہت مہنگے اور عام آدمی کی پہنچ سے دور تھے، لیکن ایک عرصے بعد منظر نامہ بدلا اور ٹیلی ویژن کے فروغ کے لیے دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی ایک طرح کا شوق بیدار کرنے کی سعی اور اسے مقبول بنانے کی منظم کوشش کی گئی۔

ٹیلی کاسٹ کا آغاز

۱۵؍ستمبر ۱۹۵۹ء کو یونیسکو (Unisco) کی مدد سے تجرباتی طور پر دہلی میں ٹیلی ویژن نشریات کا آغاز ہوا۔ اس وقت اس کی پہنچ شہر دہلی کے کچھ حصوں تک تھی اور ہفتے میں ایک مرتبہ صرف ایک گھنٹے کے لیے پروگرام نشر ہوتا تھا۔ یہ پروگرام دہلی میں صرف چند جگہوں پر کمیونٹی ویونگ سیٹس (Community viewing sets) کے ذریعے دیکھے جا سکتے تھے اور یہ سیٹس بھی چند جگہوں پر ہی مہیا تھے۔ ظاہر ہے یہ تجرباتی نشریات بہت محدود تھیں اور جن لوگوں کی رسائی ان ٹیلی ویژن کلبوں تک نہ تھی وہ اس ذریعہ سے واقف تک نہ تھے۔ یہ صورت حال ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ء تک رہی۔

۱۹۶۱ء میں جب کمیونٹی ویونگ سیٹس کے ذریعے صرف

دہلی میں ہفتہ میں ایک گھنٹے کا ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا اس وقت تجرباتی طور پر اسکول ٹیلی ویژن متعارف کرایا گیا جس میں کافی کامیابی حاصل ہوئی اور کافی بڑی تعداد میں طلبہ و اساتذہ اس میں دلچسپی لینے لگے۔

۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۵ء تک نشریات کا وقت ہفتہ میں ایک گھنٹے ہی رہا مگر ۱۵/اگست ۱۹۶۵ء سے ہفتہ میں ایک گھنٹے کے بجائے نشریات روزانہ ایک گھنٹے ہونے لگیں۔ گرچہ ٹی وی سیٹس کا معاملہ جوں کا توں رہا، لیکن اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کچھ زیادہ لوگوں کو ٹی وی دیکھنے کا موقع ملنے لگا۔ دہلی کے بعد ۱۹۷۲ء میں ممبئی میں ٹیلی ویژن کا دوسرا مرکز قائم کیا گیا۔ ٹیلی ویژن کا ممبئی سینٹر ہندوستان میں پیشہ ورانہ مہارت کا حامل پہلا سینٹر ہے۔ اسی کے ذریعے ہندوستان میں پہلی بار پروفیشنل ٹیلی کاسٹ شروع کیا گیا۔

ممبئی میں ٹیلی ویژن سینٹر کے قیام کے ایک سال بعد ہی پونے میں پہلا ریلے سینٹر قائم کیا گیا جس سے ممبئی سینٹر کے پروگرام ریلے کیے جانے لگے اور اس کی وجہ سے ممبئی کے پروگرام مہاراشٹر کے دیہی علاقوں تک پہنچنے لگے۔

ممبئی میں پروفیشنل سینٹر اور پونے میں ریلے سینٹر کے قیام کے بعد ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں وہ اہم موڑ آیا جس نے اس ذریعہ ابلاغ کی مقبولیت کی حدوں کو وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور وہ تھا سیٹلائٹ کا آغاز۔

امریکہ کے سیٹلائٹ ٹی وی پروگرام کی مدد سے ہندوستان کی چھ ریاستوں کے تقریباً دو ہزار دیہات ٹی وی کی حدود میں آ گئے۔ حکومت کی طرف سے ان مقامات پر مشترکہ اور اجتماعی طور پر دیکھے جانے والے ٹی وی سیٹس مہیا کرائے گئے اور گاؤں کی چوپال داستانوں، کہاوتوں اور سوانگوں کی دنیا سے نکل کر اچانک ٹیلی ویژن کی متحرک تصویری دنیا میں داخل ہو گئی۔ اس ترقی کا مقصد گاؤں کے باشندوں تک تعلیم اور صحت مند تفریح کے ساتھ ان کے کام میں پروگراموں کے ذریعہ مدد کرنا تھا، اس لیے ان نشریات کو عام طور پر دیہات کی ضروریات، مسائل اور مزاج کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جانے لگا۔

گرچہ یہ سب کچھ تجرباتی طور پر شروع کیا گیا تھا، مگر یہی کامیاب تجربہ آگے چل کر ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں اہم موڑ ثابت ہوا اور یہیں سے اس منزل کی راہ نکلی جس کا ایک روپ ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی بے پناہ مقبولیت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ بات ۱۹۷۵ء کی ہے۔

۱۵/اگست ۱۹۸۲ء کو ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش دن قرار دیا جانا چاہئے، اس لیے کہ اس دن انسیٹ (I) کے ذریعے پورے ملک کی نشریات کو ایک لڑی میں پرو دیا گیا اور دہلی سے قومی نشریات نیشنل پروگرام کا آغاز ہوا اور پورے ملک میں ایک پروگرام ایک ساتھ بیک وقت دیکھنے کی سہولت مہیا ہوئی، جس سے ملک کی مشترکہ تہذیب کو فروغ ملا۔

۱۵/اگست ۱۹۸۲ء کا دن ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں اس لیے بھی اہم ہے کیونکہ اسی دن یہاں رنگین نشریات، کلرٹر انسمیشن شروع کیا گیا۔

نومبر ۱۹۸۲ء ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ایک اور اہم دن ہے۔ اسی دن ۱۹/نومبر ۱۹۸۲ء کو نویں ایشیائی کھیلوں کو پہلی بار براہ راست نشر کیا گیا۔ اس سے پہلے صرف ریکارڈ کی گئی چیزوں کو ہی دکھایا جاتا تھا۔ ۱۹/نومبر ۱۹۸۲ء سے براہ راست نشریات کی سہولیات میسر آئیں اور نویں ایشائی کھیلوں کو نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی براہ راست دکھایا جا سکا۔

ستمبر ۱۹۸۴ء میں دوسرے چینل کا آغاز کیا گیا اور کچھ دن بعد مزید نئے چینلز شروع کئے گئے ان نئے چینلز میں مقامی ضروریات کو ترجیح دی گئی۔ ان چینلز کو ریجنل لنگویج سیٹلائٹ چینلز (RLSS) کہا جاتا ہے۔

اس کے چند سال بعد سیٹلائٹ چینلز کو اپنے ہی ملک سے چلانے کی اجازت کے بعد نجی زمرے کے چینلز کی باڑھ سی آ گئی اور اب ہر طرح کے چینل ہمارے ملک میں موجود ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہی ہو رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے ملک میں ٹی وی کی تاریخ بہت قدیم نہ ہونے اور اس ذریعہ ابلاغ کے یہاں دیر سے عام ہونے کے

باوجود اس کا مستقبل روشن بھی ہے اور معرکتہ الآرا بھی ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تکنیکی طور پر خودکفیل ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر بھی خودکفیل ہوں تا کہ اس طاقتور اور موثر ذریعے کا استعمال انسانی اخلاقی قدروں، تہذیبی بقا، صحت، تفریح، ذہنی ارتقا اور انسانیت کی فلاح کے لیے ہو سکے۔

عوامی ذریعہ ترسیل و ابلاغ میں کوئی ذریعہ ایسا نہیں ہے جس میں اردو کی ضرورت اور اہمیت مسلم نہ ہو، مگر عام طور پر تمام برقی مواصلاتی نظام اور خاص طور پر ریڈیو اور ٹی وی میں اس زبان نے بہت ہی موثر کردار ادا کیا ہے اور ٹیلی ویژن میں تو یہ زبان ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔اس زبان کی اشاریت و بلاغت اور اس کی شیرینی و حسن ہر جگہ کام آتے ہیں۔

بظاہر یہ بات کچھ اٹ پٹی سی لگتی ہے کہ تکنیکی ترقی کے اس دور میں زبان کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہو، لیکن حقیقت یہی ہے۔کم ازکم اردو زبان کے بارے میں تو یہ دعویٰ سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ضرورت، افادیت اور اہمیت میڈیم کے حوالے سے پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

یہ زمانہ تخصیص اور اختصار کا زمانہ ہے۔ انسان کے پاس فرصت کے لمحات کم اور ضرورت زیادہ ہیں اور اردو ایک ایسی جامع زبان ہے کہ اختصار اور تاثر پذیری اس کی ذاتی خصوصیات ہیں اور یہ تاریخی اعتبار سے اپنی پیدائش سے رابطہ کی زبان ہے۔

ٹیلی ویژن کی مقبولیت کے موجودہ دور میں اشتہارات کی اہمیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ ٹی وی پر اشتہار دکھانے اور دکھانے کے لیے بنانے کی قیمت بہت زیادہ ہے، کبھی کبھی تو سکنڈوں میں دکھایا جانے والا اشتہار لمبے لمبے پروگراموں سے کہیں زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔ایسی صورت حال میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ مواد کھپا دینا ضروری ہوتا ہے اور اس جامعیت و اختصار کے لیے اردو زبان موزوں ترین زبان ہے اس لیے بیشتر اشتہارات کی زبان اردو ہوتی ہے۔

کسی بھی وقت ٹی وی پر دکھائے جانے والے اشتہارات کو چند منٹ غور سے سنئے ممکن ہو تو اس میں بولے جانے والے الفاظ نوٹ کر لیجئے، آپ پائیں گے کہ استعمال کی جانے والی زبان میں غالب عنصر اردو کا ہوگا، لیکن ظاہر ہے یہ زبان روزمرہ کی بول چال کی زبان ہوگی۔ بولے جانے میں کیونکہ رسم خط کا مسئلہ نہیں ہے اس لیے بات اور بھی آسان ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اشتہارات لکھنا ایک پروفیشنل معاملہ ہے اور کسی حد تک تکنیکی بھی، لیکن خیال کو لفظوں میں ڈھال سکنے والوں کے لیے یہ کوئی بہت بڑی رکاوٹ نہیں ہے بس ذرا سی مشق اور معلومات سے اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

یہ تو اردو زبان کی ٹی وی میڈیم میں اہمیت کی صرف ایک مثال تھی، ورنہ ذرا غور کیجئے کہ انگریزی اور علاقائی زبانوں کے علاوہ جتنے پروگرام بھی ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں انھیں کسی وجہ سے عنوان کچھ بھی دیا جاتا ہو، مگر ان سب میں اردو کا استعمال ناگریز ہے، اس لیے کہ تمام تر نامساعد حالات کے باوجود اس زبان کا اثر ورسوخ عوامی زندگی میں نہ صرف قائم ہے بلکہ بڑھ رہا ہے اور جب سے سیٹلائٹ چینلز کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے تب سے تو بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ عام طور پر تمام برقی مواصلاتی نظام خاص طور پر ٹیلی ویژن اردو زبان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا رہا ہے۔

اب دنیا برقی مواصلاتی نظام کے ذریعے ایک ایسے نقطے پر سمٹ آئی ہے کہ ایک ملک کی نشریات دوسرے ملک میں عام طور پر دیکھی جا سکتی ہیں اور اردو کا مسئلہ، اس کا دائرہ کار اس کی مقبولیت صرف برصغیر تک محدود نہیں ہے۔اب اردو ایک بین الاقوامی زبان ہے اس لیے اس زبان کی اہمیت اور ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔

ویژول میڈیم اور اردو کا تعلق کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہندوستانی فلموں نے ہمیشہ اس زبان کے ذریعہ مقبولیت حاصل کی ہے آج بھی اردو کے اثر سے مکمل طور پر آزاد ہو کر نہ کوئی فلم مقبول ہو سکتی ہے نہ ٹیلی ویژن کا کوئی پروگرام۔

بات زبان کی ہو رہی ہے تو آیئے ذرا سا شعر و ادب اور ٹیلی ویژن کے حوالے سے بھی کچھ باتوں پر غور کر لیں۔

ٹی وی میڈیم میں اردو و شعر و ادب کا استعمال ایک پر اثر صنف کے طور پر ہو رہا ہے۔غور کیجئے کون سی ایسی مقبول سیریل ہے

جس میں اردو کے مکالمے (ادب) کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔ کتنے ہی سیریل ہیں جن میں باقاعدہ اردو شاعری کا استعمال کیا جاتا ہے۔شاید ہی کسی مقبول سیریل کا ٹائٹل سونگ ایسا ہو جس نے اردو شاعری اور خاص طور پر غزل کی صنف سے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔ادب اور زبان کے حوالے سے مستقل ادبی حیثیت کے پروگراموں کی بھی کمی نہیں۔غرض کہ خبریں ہوں یا سیریل، ڈرامے ہوں یا اشتہارات، ٹی وی کی کوئی شق ایسی نہیں ہے جہاں اردو زبان کا عمل دخل نہ ہو۔

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ ویژول میڈیم کی تکنیکی ضرورتوں میں زبان کے جاننے یا نہ جاننے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا اور یہ کہ تصویر نے لفظ کی اہمیت کو بہت کم کر دیا ہے۔ یہ نہ صرف غلط فہمی ہے بلکہ عدم واقفیت کی بھی مثال ہے۔

غور کیجئے کیا ٹی وی پر دکھائے جانے والے کچھ پروگراموں کے فارمیٹ سے قطع نظر کوئی ایسا پروگرام ہوتا ہے جس میں لفظ استعمال نہ ہوتے ہوں۔اس میڈیم میں استعمال ہونے والے تقریباً ہر فارمیٹ میں بنے پروگرام کے پیچھے الفاظ ہی ہوتے ہیں اور یہ زبان ہی ہے جو تصویر کو زندہ رکھتی ہے۔

سیریل ہو، ڈراما ہو یا خبریں، دستاویزی فلم ہو یا چند سکنڈ کا اشتہار ہر جگہ زبان کی ضرورت ہے اور الفاظ کے معانی، ان کے اتار چڑھاؤ اور ان کے پس منظر سے واقفیت کے بغیر یہ کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ اب رہی بات تکنیک کی تو فی زمانہ تکنیکی افراد کے لیے عام طور پر اور ہدایت کار، کیمرہ مین اور ایڈیٹر کے لیے خاص طور پر اردو زبان کا جاننا بے حد مفید ہے، بلکہ بہت سے کام ایسے ہیں جو زبان جانے بغیر تکنیکی طور پر بھی صحیح نہیں ہو سکتے۔مثلاً اگر ایڈیٹر کو یہ پتہ نہ ہو کہ مصرع کہاں ختم ہوا تو وہ اس منظر کو ایڈٹ نہیں کر سکتا جس میں شعر استعمال ہوا ہے۔اگر کیمرہ پرسن کو زبان نہیں آتی تو وہ اس زبان کی تہذیب سے مطابقت رکھنے والے زاویوں کو استعمال نہیں کر پائے گا، کیونکہ ٹیلی ویژن میڈیم میں بیشتر تکنیکی کام تخلیقی اور تخیلی قوتوں سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ ان کے کرنے والوں کو صرف مشین آپریٹر نہیں کہا جا سکتا بلکہ مشین کا تخلیقی استعمال ہی تکنیکی لوگوں کو ممتاز ماہر اور مکمل بناتا ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ صرف اردو زبان جان لینا ویژول میڈیم کے لیے کافی ہے۔ظاہر ہے اردو یا کوئی بھی زبان جاننا اسی وقت کام آ سکتا ہے جب اس شعبے سے متعلق دیگر مہارتیں حاصل کر لی جائیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر اردو والا ٹی وی میڈیم کے کسی تکنیکی شعبہ میں مہارت حاصل کر لیتا ہے تو اردو زبان کا جاننا اس کے لئے بڑی قوت بن جاتی ہے جس کے ذریعے وہ امتیاز حاصل کر سکتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے ٹی وی میڈیم کے تکنیکی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کر کے زبان کا تخلیقی استعمال کرنے کی کوشش کریں اور غیر اردو والے تکنیکی افراد اردو زبان سے واقفیت حاصل کریں تا کہ اپنی تکنیکی صلاحیتوں میں صرف زبان نہ جاننے کی وجہ سے ماہر کہلانے سے محروم نہ رہ جائیں اس لیے کہ ٹی وی میڈیم میں مواد اور تکنیک دونوں میں تطبیق اور دونوں سے دلچسپی کے بغیر اس کے تقاضوں کو مکمل طور پر پورا نہیں کیا جا سکتا۔زبان تکنیک کی اور تکنیک زبان کی حریف نہیں، حلیف ہے اور عام طور پر یہ ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ برقی مواصلاتی نظام اور خاص طور پر ٹیلی ویژن میں اردو زبان کا موثر کردار جاری ہے۔ ❁❁

دوست اور دوستی

- ☆ دوستوں کو مصیبت اور پریشانی میں چھوڑنا بزدلی ہے
- ☆ آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمانا اور ہر ایک شیریں زبان کو دوست سمجھ لینا سخت غلطی ہے
- ☆ دوستی ایک مقدس رشتہ ہے جس کی بنیاد اعتماد اور وفا پر ہے
- ☆ دوست کا امتحان مصیبت میں ہوتا ہے
- ☆ کسی شہنشاہ کے تاج سے قیمتی، موتیوں سے زیادہ چمکدار اور چاندنی رات سے زیادہ پر کشش اگر کوئی چیز ہے تو وہ دوستی میں وفاداری ہے۔
- ☆ دوستی کا نازک دھاگا دراصل فرشتوں نے تھام رکھا ہے، محبت اور خلوص کی پریاں جس کی حفاظت کرتی ہوں، اسے دنیا کی مخالفت کیسے توڑ سکتی ہے

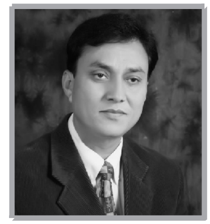

ڈاکٹر پرویز شہریار

Flat No.4/48, NCERT Campus, Sri Aurobindo Marg, New Delhi 110016

افسانہ ''گرہن'' کا تنقیدی جائزہ

راجندر سنگھ بیدی کے افسانہ ''گرہن'' کا شمار ان کے چند انتہائی اہم اور نمائندہ افسانوں میں کیا جاتا ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اس افسانے کا تنقیدی جائزہ گویا بیدی کے نظریۂ فن اور ان کے فکری سروکار کو اجاگر کرنے کے مترادف ہے۔اس افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ہولی اپنی سسرال میں ایک ستائی ہوئی عورت ہے۔اس کے چار بچے ہیں جو گزشتہ چھ سال میں پیدا ہوئے ہیں اور پانچواں بچہ پیٹ میں ہے۔سارنگ دیوگرام میں اس کا میکہ ہے۔وہ اپنی سسرال والوں سے اس قدر عاجز آچکی ہے کہ بھاگنے کے کئی ناکام ارادوں کے بعد چاند گرہن والی رات میں ایک بار پھر کوشش کرتی ہے، جب سمندر میں نہانے کے لیے عورتیں اور مرد الگ الگ جگہوں پر چلے جاتے ہیں، لیکن اس رات اپنے ہی گاؤں کا ایک نوجوان کتھورام جو کہ اس کے بچپن کا ساتھ کھیلا ہوا ہے اور سرائے کا مالک جو نشے میں چور ہے وہ دونوں اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے لیے دوڑ رہے ہیں۔ ''پکڑو، پکڑو'' اور وہ بھاگ رہی ہے۔ دوسری طرف اس کی سسرال اساڑھی گاؤں سے آواز آتی ہے۔ ''چھوڑ دو، چھوڑ دو'' دان کا وقت ہے اور وہ حاملہ اپنا پیٹ پکڑے گرتی پڑتی بے تحاشہ بھاگ رہی ہے۔

ہولی کا شوہر رسیلا ہے جو ہولی کی صحت اور سندرتا کا حاسد ہے۔ہولی کی سوچ میں وہ ایک راہو کی طرح کالا سا راکشس جیسی شکل والا شخص ہے جو بچے کی پیدائش کے سوا مہینے کے اندر ہی بیوی کی قربت کا جویا ہو کر اس کے پاس آدھمکتا ہے۔تیسرا کردار ہولی کی ساس میا کا ہے جو اسے اٹھتے بیٹھتے گالی گلوچ کے انداز میں طعن وتشنیع کرتی رہتی ہے۔ دونوں ماں بیٹوں نے اس کا جینا حرام کر رکھا ہے۔اس کا دیور بھی اسے پیٹتا ہے۔ ہولی کے چار بچے روپو، شبو، کتھو اور منا ہیں جنہیں وہ اپنے سسر کے پاس جب کبھی ضرورت ہو، چھوڑ کر جاتی ہے۔اس کا سسر بھی اسے ڈانٹتا ہے۔رسیلا جنس زدہ ہے اور وہ ہر صحیح غلط باتوں پر ہولی کو چپت لگا دیتا ہے، اس پر میا جھوٹے ڈھونگ رچا کر بیٹے کو ڈانٹتی ڈپٹتی رہتی ہے، لیکن ہولی کو یہ سب اچھا نہیں لگتا ہے۔ اسے اپنے میکے سارنگ دیوگرام کی یاد بہت آتی ہے۔ وہ اپنے کنوارے پن کے دنوں کو بڑے چاؤ سے یاد کرتی ہے۔عورت کی بپتا یہ ہے کہ جب میکے میں ہو تو سسرال کو بڑے چاؤ سے یاد کرتی ہے اور جب سسرال آتی ہے تو میکے کی یاد اسے بے چین کر دیتی ہے۔

میکے کی یاد اسے اس لیے بھی زیادہ آتی ہے کہ وہ ایک متمول ساہوکار سیتل کی بیٹی تھی لیکن سسرال میں کائستھوں کے ہاتھوں اسے ذلیل ہونا پڑتا تھا۔ چار بچوں، تین مردوں، دو عورتوں اور چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور وہ اکیلی سب کے کھانے پینے کا انتظام کرتی اور روزانہ ان کے جھوٹے برتنوں کے انبار کو صاف کرتی رہتی تھی۔اس کے باوجود ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔کائستھوں کو تو بچے چاہئیں، ہولی جہنم میں جائے۔گویا سارے گجرات میں یہ کائستھ ہی ''کل ودھو'' کا صحیح مطلب سمجھتے تھے:

> ''ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا
> ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور بچے کی وجہ سے کھایا پیا
> ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔شاید اسے روٹی
> بھی اسی لیے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے۔''

اس کی مصیبت اور پریشانی میں خود ہولی کی ضعیف العقیدگی کا بھی ہاتھ تھا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس کے سسرال والوں کو بھلا اس کی جان لینے کا کیا حق ہے۔البتہ رسیلا اس کا شوہر اس کی جان لے لے تو کوئی بات نہیں کیونکہ:

''شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس
چھری سے مارے اس چھری کا بھلا......''

اور یہی کمزوری اس کی گرہست زندگی کو تہس نہس کر کے جہنم کی آگ میں بدل دیتی ہے اور بالآخر وہ اپنی عصمت وعفت بھی بچا نہیں پاتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی نے ''گرہن'' میں اس صدیوں سے چلے آرہے میتھ پر چوٹ کی ہے جس میں چاند گرہن کے وقت اس لیے دان پن کیا جاتا ہے کہ انسان کے سال بھر کے پاپ ڈھل جائیں۔ سمندر میں اشنان کرنے، پھول، بتاشے اور مشک کافور کے چراغ پانی میں بہانے سے گناہ نہیں دُھلتے اور مرنے کے بعد کے سفر میں میا جیسی گنا ہگار اور ظالم ساس کے راستے روشن نہیں ہوتے بلکہ اس کے لیے تزکیہ نفس زیادہ ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ عورت کو مرد اپنی ہوس کا شکار بناتا آیا ہے اس کی اس بہیمیت پر رسم ورواج اور مذہب اور عقائد سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔ چاند گرہن کے وقت ہندو عقائد کے مطابق نیک کام کرنے چاہئیں تاکہ راہو اور کیتو نام کے راکشس اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہوسکیں اور وہ اندو (چاند) کو چھوڑ دیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان سے بڑا راکشس شاید صفحۂ ہستی پر کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا ہے۔ جنس زدہ انسان خواہ رسیلا ہو یا کہ کتھورام انہیں کسی موسم، کسی رشتے کی پرواہ نہیں، حتیٰ کہ عورت کی جسمانی کیفیت کس بات کی متقاضی ہے، اس کی بھی انہیں چنداں پرواہ نہیں ہوتی۔ وہ کتھورام گاؤں کا منھ بولا بھائی، بچپن کا ساتھی، ایک بے سہارا، تنہا اور یہاں تک کہ اپنے ہی گاؤں کی ایک حاملہ عورت سے بھی اپنی جنسی ہوس پوری کرنے میں کوئی دریغ نہیں کرتا اور کوئی عار محسوس نہیں کرتا بلکہ اپنی اس شرم کو دور کرنے کے لیے وہ شراب پیتا ہے اور سرائے کے مالک کو بھی اس بدکاری میں مدعو کر لیتا ہے جو وہ شاید نشے کے بغیر نہیں کرسکتا تھا، دوسرے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نشہ بھوگ ولاس کے جوش کو دوبالا کر دیتی ہے۔

بیدی نے صدیوں سے چلے آرہے اس ریتی رواج کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ بیدی کو عورت کی مظلوم ذات سے ازلی ہمدردی رہی ہے۔ انہوں نے ''ایک چادر میلی سی'' میں بھی اس مقدس جگہ کوٹلہ میں ڈھونگی دھرماتماؤں کے ذریعے ہونے والی بدکاری کا پردہ فاش کیا تھا جہاں ویشنو دیوی نے بھیروں کے چنگل سے خود کو بچا کر گھڑی دو گھڑی کے لیے بسرام کیا تھا اور وہیں تلوکا کی مدد سے دھرم شالہ کے مالک چودھری مہربان داس اور اس کے بھائی گھنشیام داس اور لوہے کی لنگوٹ والے باواہری داس ایک بارہ تیرہ سال کی جاترن لڑکی کے ساتھ اپنی جنسی ہوس کی آگ ٹھنڈی کرنے کے چکر میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

بیدی کو دیوی کا جلالی روپ پسند ہے جب وہ چنڈی، بھیروی اور کالی کا روپ اختیار کر لیتی ہے، لیکن انہیں مظلوم عورتوں سے ہمدردی ہے۔ مرد اس سماج کا وہ ظالم جانور ہے جو عورت کو راہو کیتو بن کر اسے گہنانے کی تاک میں ہر دم لگا رہتا ہے۔ سادھو مہاتما ہوں کہ دور پاس کے رشتے دار حتیٰ کہ خود شوہر اس کے ساتھ بہیمانہ سلوک کے ساتھ پیش آتا ہے۔ پسماندہ سماج کے اس طبقے میں سسر اور دیور بھی اس پر مظالم ڈھاتے ہیں۔ ہولی اس کی بہترین مثال ہے۔ یہاں گرہن ایک ایسے سماج کا استعارہ بن جاتا ہے جس میں بقول وارث علوی:

''ازدواج مسلسل جنسی سرگرمی کا وہ پروانہ ہے جو خود سماج
افراد معاشرہ کو بہ رضا ورغبت عطا کرتا ہے۔''

رسیلا ہولی کو جو کہ خود اس کی بیوی ہے، ہوس کی نظر سے دیکھتا ہے، اس وقت بھی جب کہ وہ حاملہ ہے اور اس کے پانچویں بچے کی ماں بننے والی ہے:

''رسیلے نے ایک پرہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔
اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو
چھوا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے
دیور کو آوازیں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی
چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات
نہیں ہوتی۔ رسیلا آواز کو چباتے ہوئے بولا: 'میں پوچھتا
ہوں بھلا اتنی جلدی کا ہے کی تھی؟'، 'جلدی کیسی؟' رسیلا
پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: 'یہی ......تم بھی
تو کتیا ہو، کتیا؟' ہولی سہم کر بولی: 'تو اس میں میرا کیا
قصور ہے؟' ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی، بدچلن،
ہوس راں سبھی کچھ کہہ دیا۔ چوٹ سیدھی پڑی۔ رسیلا کے

پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔لاجواب آدمی کا
جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے
نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے۔''

ہولی کو اس کی سسرال میں ہر بات پرٹوکا جاتا ہے۔اس کی تعلیمی لیاقت کا افسانے میں ذکر نہیں ہے، تاہم اس کے حرکات وسکنات سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی اندو بھی نہیں تھی، لیکن وہ فطری طور پر سمجھدار بہت تھی، جب کہ ہولی زیادہ سمجھدار بھی نہیں ہے، کیونکہ افسانے کے اختتام میں رونما ہونے والے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک اَبلا ناری ہے اور اپنے لیے مصیبت خود بھی کھڑی کر لیتی ہے۔ جب وہ بھاگنے کا ارادہ کرتی ہے اور اس خیال سے گرہن والی رات کا انتخاب کرتی ہے، تو اُسے معلوم ہے کہ:

''آٹھ بجے اسٹیمر لانچ کی آخری سیٹی تھی۔ پھر وہ سارنگ
دیوگرام کی طرف روانہ ہوگا۔ اگر ہولی اس پر سوار
ہوجائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے
ہوئے گویا صدیوں سے آشنا کلس دکھائی دینے لگیں......
اور پھر وہی اماں......کنوار پن اور گربا ناچ!''

لیکن ان سب معلومات کے باوجود وہ ٹکٹ خریدنے کے لیے اپنے پاس پیسے نہیں رکھتی ہے۔ اپنے شوہر اور ساس سے جدا ہوتے وقت وہ اپنی دھوتی میں چند روپے اُڑس سکتی تھی، لیکن اس کی اس ایک بے وقوفی سے وہ ہوس راں ٹینڈل اور دیگر تین چار آدمیوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ تو جاتی ہے، مگر کتھورام اور سرائے کے مالک اسے اپنا شکار بنا لیتے ہیں۔ ہولی کے سسرال سے بھاگنے کے ارادے میں کوئی کمی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ اپنے بیٹے شبو سے جدا ہوتے وقت وہ جذباتی ہوکر اس کا منھ چوم لیتی ہے اور اس کے آنسوؤں کا گرم گرم قطرہ جب شبو کے گالوں پر پڑتا ہے تو وہ بھیڑ میں کچھ نہ سمجھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

سسرال کی مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسی ہوئی تنہا عورت پلٹ کر جب اپنے میکے کو دیکھتی ہے تو تصور میں اسے اپنے گاؤں سارنگ دیوگرام کی خوبیاں، اپنی سکھی سہیلیاں اور کنوارے پن کی آزادیاں بےطرح سے یاد آنے لگتی ہیں:

''کس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے
ساتھ گربا ناچا کرتی تھی اور بھابی کے سر پر رکھے ہوئے
گھڑے کی سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر
دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی۔ اس
وقت سب عورتیں اپنے حنا بالیدہ ہاتھوں سے تالیاں
بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں:

ماہندی تو ادی مالوے
اینو رنگ گیو گجرات رے
ماہندی رنگ لاگیو رے

اس وقت وہ ایک اچھلنے کودنے والی الھڑ چھوکری تھی۔
ایک بحر و قافیہ سے آزاد نظم، جو چاہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔
گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ نباب جادی تو نہ تھی اور
اس کی سہیلیاں، وہ بھی اپنے اپنے قرض خواہوں کے
پاس جا چکی ہوں گی۔'' (ماہندی، حنا تو مالوہ: وسط ہند میں پیدا ہوئی۔
اس میں گجرات رنگا ہوا ہے۔ گویا اسے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہولی، اندو کی طرح سمجھدار اور سگھڑ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ رسیلا نے جو برتاؤ روا رکھا ہے اس سے اس کے جسم اور دماغ بری طرح ضعف کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس سب کے باوجود وہ اچھے اور برے میں تمیز ضرور کر سکتی ہے:

''اس کی آنکھوں کے گرد گہرے، سیاہ حلقے پڑنے لگے،
گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔
وہ ہولی جسے پہلے پہل میا پیار سے چاند رانی کہہ کر پکارا
کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا رسیلا حاسد تھا،
گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔''

اپنی اس ناگفتہ بہ حالات کے باوجود وہ جانتی ہے کہ میا نے جو اس پر مظالم ڈھائے ہیں، اسے ستانے کا جو ارتکاب گناہ کیا ہے، وہ ناقابل معافی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ چاند گرہن کے وقت کے اشنان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گزشتہ سال کرتے رہے ہیں۔ اشنان سے سب پاپ دھل جاتے

ہیں، بدن اور روح پاک ہوجاتے ہیں، سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور، بہت دور ایک نامعلوم، ناقابل عبور، ناقابل پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہوجاتے ہیں، پھر گہنا جاتے ہیں، پھر دیا کی ایک لہر آتی ہے اور پھر پاک صاف۔ اس کے باوجود اسے ڈر ہے کہ میا نے جو گناہ کیے ہیں، وہ اس سمندر کے پانی سے دھلنے والا نہیں ہے:

''بڑی اماں کے ہاتھ میں رودرکش کی مالا کے علاوہ مشک
کافور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں میں بہا دینا چاہتی
تھی تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن
ہوجائے اور ہولی ڈرتی تھی۔ کیا اس کے گناہ سمندر کے
پانی سے دھل جائیں گے؟''

غروب آفتاب کے بعد ہر پھول بندرگاہ پر سمندر کے کنارے، گھاٹ سے پون میل کے قریب اسٹیمر لانچ میں ہولی ایک کونے میں بدحواس ہوکر بیٹھی رہتی ہے۔ اس کی بدحواسی کے دیگر کئی وجوہات میں ایک سب سے اہم وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے پاس ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ جب یہ بات لانچ کے ٹینڈل کو معلوم ہوتی ہے تو وہ دیگر ملازموں سے سرگوشیوں میں ہولی کی بے چارگی کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی بات کرنے لگتے ہیں، لیکن سوئے اتفاق وہاں اس کے گاؤں کا بچپن کا ساتھ کھیلا ہوا کتھورام چلا آتا ہے جو آبکاری کا سپاہی ہے۔ اسے دیکھ کر وحشیوں کے ناپاک ارادوں اور ان کے قہقہوں کی بلند آوازوں سے سہمی ہوئی ہولی کے حواس بجا ہوجاتے ہیں، وہ سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیتی ہے، دلیری سے بلاتی ہے اور اپنی یقین سے معمور، لیکن بھرائی ہوئی آواز میں کہتی ہے:

''کتھو بھیا، مجھے سارنگ دیوگرام پہنچادو......'' تبھی کتھورام کو
ہولی کی مجبوری کا پتہ چلتا ہے جب ان میں سے پاس
کھڑا ایک ٹینڈل کہتا ہے: بچاری کوئی دکھیا ہے۔ اس کے
پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے،
ہم اس کی کیا مدد کرسکتے ہیں؟''

کتھورام بھی اسی سماج کا ازلی مرد ہے جس کے اندر کا سگ اس بات سے ہوشیار ہوجاتا ہے کہ وہ اساڑھی سے بھاگ کر آئی ہے۔ اس کے اندر کی کلبیت ایک انگڑائی لے کر جاگ اٹھتی ہے وہ اسے مزید دھمکانے لگتا ہے:

''یہ سریپھ جادیوں کا کام نہیں ہے اور وہ اگر کائستھوں کو
خبر کردے تو پھر کیا ہوگا۔''

ہولی ڈر سے کانپنے لگتی ہے:

''کیونکہ نہ تو وہ نباب جادی تھی اور نہ سریپھ جادی۔''

کتھورام اسے یقین دلاتا ہے کہ:

''ڈرو نہیں ہولے... میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔
یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ پو پھٹے لے چلوں گا۔
یوں گھبراؤ نہیں۔ رات کی رات سرائے میں آرام کرلو۔''

لیکن کتھورام جب سرائے کے مالک کے دریافت کرنے پر ہولی سے متعلق جواب دیتا ہے کہ ''یہ میری پتنی ہے'' تو ہولی گھبرا کر بدحواسی میں اپنا پیٹ پکڑ کر دیوار کے سہارے سرکتی ہوئی وہیں ڈھیر ہوجاتی ہے۔

کتھورام سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیتا ہے اسے کمرے میں چھوڑ کر خود شراب پی کر اندر آتا ہے۔ اس کے بعد آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرضہ وصول کیا تھا۔ دو دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لیے سراسیمہ ادھر ادھر دوڑ رہے تھے جو ابھی ابھی سرائے سے نکل کر بھاگی تھی۔ سرپٹ، بگٹٹ...... وہ گرتی تھی، بھاگتی تھی، پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی، ہانپتی اور دوڑنے لگتی:

''دور، اساڑھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں......
دان کا وقت ہے......چھوڑ دو......چھوڑ دو......چھوڑ دو
......ہر پھول بندر سے آواز آئی: پکڑلو......پکڑلو......
پکڑلو......چھوڑ دو......دان کا وقت ہے......پکڑلو......
چھوڑ دو!!''

وارث علوی نے گرہن کا آرکی ٹائپ ایک بلبل گرفتار کو بتایا ہے جو قفس سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ وہ ہولی کی ذہنی کیفیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اس کی صرف ایک ہی خواہش ہے کہ سفینۂ غم کو کہیں
ساحل مل جائے۔ ہولی کا پورا وجود دکھ کا تاریک زنداں
ہے اور اس میں صرف ایک خواہش رہ گئی ہے، خواہش

نجات، قید سے رہائی، مکتی......مکتی......مکتی......!''

انہوں نے مزید لکھا ہے کہ یہاں بیدی کا جملہ پورے ہندوستانی معاشرے پر طنز ہے، جہاں زندگی کا دوہرا معیار اختیار کیا جاتا ہے۔ ایک انسان سے جانوروں سے بدتر سلوک کرنے کے باوجود چاندگرہن کے وقت پوجا پاٹ اور اشنان کرنے سے وہ سمجھتے ہیں کہ سارا پاپ دھل جاتا ہے۔ گرہن کے اسطوری پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے وارث علوی نے مزید اپنے خیال کا اظہار کیا ہے کہ:

''بیدی نے افسانہ کا تاروپود اس طرح بنا ہے کہ عورت سماج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ایک وجودی فینومینا بن گئی ہے۔ چاندگرہن کا پس منظر اسے سماجی فینومینا سے اٹھا کر کائناتی تناظر عطا کرتا ہے۔ سماج کی مخالف قوتوں کا شکار عورت اب بے رحم فطرت اور لب بند کائنات کا فینومینا بن جاتی ہے...... بیدی کا کمال یہ ہے کہ زندگی کی مانوس حقیقتوں اور عام واقعات سے بنی ہوئی ایک گھریلو کہانی سناتے سناتے اسے ایک ایسے عروجی نکتہ پر پہنچاتے ہیں جہاں عورت کی بے بسی ایک نامہربان کائنات میں وجود کا ہولناک المیہ بن جاتی ہے۔''

ہولی شوہر، ساس اور سپاہی کی شیطانی چال میں پھنس کر خود کو تباہ ہونے سے بچا نہیں پاتی ہے۔ قارئین کو تعجب ہوتا ہے کہ ہولی اپنے میکے میں اپنے باپ سیتل ساہوکار کو سندیسہ کیوں نہیں بھیجتی ہے۔ حیات اللہ انصاری نے رسیلے کے غصے کو شہوت میں ٹھکرائے ہوئے مرد کے غصے سے زیادہ اہمیت نہیں دی ہے اور جہاں تک آبکاری کے سپاہی کا تعلق ہے شمس الرحمٰن فاروقی نے اسے ایک اچھے انسان کا فرض یاد دلایا ہے یہ کہہ کر کہ اسے چاہیے تھا کہ وہ ٹکٹ خرید کر ہولی کو سیوا گرام کی طرف روانہ کر دیتا۔

بہرحال، وارث علوی نے اس افسانے کے تجزیے کے دوران چند بہت اہم سوال اٹھائے ہیں جن کا تعلق آرٹ کے تفاعل سے ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''مثلاً ہولی کا کیا ہوا، وہ مرگئی، خودکشی کی، اس کا اسقاط ہوگیا، آرٹ کے جادو نے گہنائے ہوئے چاند کی مانند بھاگتی ہوئی ہولی کو بھی ایک ایسا فینومینا بنا دیا کہ ہم اسے خوف اور حیرت سے اسی طرح دیکھتے ہیں جیسے ایک ٹوٹتے ہوئے تارے کو اور یہ سوال نہیں پوچھتے کہ تارا کہاں پر جا کر گرا۔ یہ افسانہ ہی ایسا ہے جس کا انجام واضح، قطعی اور دوٹوک نہیں ہوسکتا۔ افسانہ کا انجام ہولی کا انجام ہے اور ہولی کی جو کہانی بیان کی گئی ہے اس کا انجام کیا ہوا، ہم نہیں جانتے۔''

راجندر سنگھ بیدی کے تخلیقی سفر میں ''گرہن'' کو فنی اعتبار سے ایک Break through کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''دانہ ودام'' کی مطلق حقیقت نگاری جس پر چیخوف اور گوگول کے اثرات بتائے جاتے تھے، یہ افسانہ ان سے یکسر مختلف فنی تکنیک اختیار کر لیتا ہے۔ موضوع وہی معمولی گھر گرہستی کی روزمرہ کی زندگی ہے، لیکن پیشکش غیر معمولی ہے۔ اس میں سطحی بیانیہ انداز اختیار کرنے کے بجائے معنوی تہہ داری اور دیومالائی اسطورہ نے جادوئی اثرات پیدا کر دیے ہیں۔ اساطیر کی روشنی میں کردار کے سائے طویل القامت معلوم ہونے لگتے ہیں۔ مظفر علی سید نے ''گرہن'' کے تجزیاتی مطالعہ میں لکھا ہے کہ:

''ذرا ایک نظر 'گرہن' پر ڈال کر دیکھئے اور سوچئے کہ کیا اب بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ 'بیدی کے یہاں تیز جذباتیت، غیر معمولی واقعات اور طوفانی حادثات شاذ ہی ملتے ہیں'۔ کیا اب بھی یہ قول درست ہے کہ 'روزمرہ کے معمولی سے معمولی واقعات، عام جذبات واحساسات اور سیدھی سادی حقیقت کو نرمی، لطافت اور پاکیزگی سے پیش کرنے کا ان میں چیخوف کا سا سلیقہ ہے اور ان کے افسانوں کو یہ سیدھی سادی حقیقت ہی لطیف اور دلکش بنا دیتی ہے۔''

بیدی کو اس بات کا اعتراف ہے کہ:

''لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں نفس مضمون کا محض ظاہری (جسمانی) پہلو پیدا ہوا۔ یہاں تک تو مشاہدے کا تعلق تھا۔ اس کے بعد میرے تخیل نے طنز کی صورت میں ایک باطنی پہلو تلاش کر لیا۔ ذہن و تحریر میں دونوں آپس میں

یوں گھل مل گئے کہ مجموعی طور پر ایک تاثر کی صورت
اختیار کر لی۔''

آل احمد سرور نے بیدی کے قدرے بعد کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:

''پریم چند کی آدرشی حقیقت نگاری جو کرشن کے یہاں رومانی حقیقت نگاری نظر آتی ہے، بیدی کے یہاں ایک ایسی حقیقت نگاری بن جاتی ہے جو اسطور اور دیو مالا کے سایوں کی وجہ سے حقیقت سے کچھ بڑی اور کچھ پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔''

اس تناظر میں گرہن کی اہمیت اس لحاظ سے بڑھ جاتی ہے کہ بیدی نے پہلی بار اس افسانے میں دیو مالا کا براہ راست استعمال کیا تھا۔ جس طرح دیولوک میں چاند اور سورج کی شکایت پر امرت پینے والے راہو کا وشنو بھگوان نے اپنے سدرشن چکر سے سر قلم کر دیا تھا اور اس کے سر اور دھڑ آسمان پر راہو اور کیتو بن کر معلق ہو گئے تھے اور ہر سال میں دو بار چاند سورج سے بدلہ لینے کے لیے چاند اور سورج کو اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں تو ان میں گرہن لگ جاتا ہے اور دان پن کے ذریعے اسے اس قرض سے نجات دلائی جاتی ہے۔ اسی طرح اس افسانے میں ہولی (چاند رانی) کو رسیلا اور کتھورام، راہو کیتو کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑتے چلے جاتے ہیں اور ہولی کو آخر کار، اپنے نام و ناموس اور جسم و جان کی بلی دے کر یہ قرض چکانا پڑتا ہے، مگر افسانے میں دوٹوک بیان کرنے کے بجائے اسے قارئین کے تخیل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے گرہن کے اساطیری پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ کہانی جس میں بیدی نے استعاراتی انداز کو پہلی بار پوری طرح استعمال کیا اور اساطیری فضا ابھار کر پلاٹ کو اس کے ساتھ تعمیر کیا ہے 'گرہن' ہے۔ اس میں ایک گرہن تو چاند کا ہے اور دوسرا گرہن اس زمینی چاند کا ہے جسے عرف عام میں عورت کہتے ہیں اور جسے مرد اپنی خود غرضی اور ہوسناکی کی وجہ سے ہمیشہ گہنانے کے درپے رہتا ہے۔ ہولی، ایک نادار، بے بس اور مجبور عورت ہے۔ اس کی ساس راہو ہے اور اس کا شوہر کیتو جو ہر وقت اس کا خون چوسنے اور اپنا قرض وصول کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ہولی کی سسرال سے میکے بھاگ نکلنے کی کوشش بھی گرہن سے چھوٹنے کی مثال ہے، لیکن چاند گرہن سے سماجی جبر کا گرہن زیادہ اٹل ہے۔ ہولی گھر کے کیتو سے بچ نکلنے کی کوشش کرتی ہے تو اسٹیمر لانچ کے کیتو کتھورام کی گرفت میں آجاتی ہے جو اسے رات بھر کے لیے سرائے میں لے جاتا ہے اور اس طرح یہ خوبصورت چاند ایک گرہن سے دوسرے گرہن تک مسلسل عذاب کا شکار ہوتا ہے۔ اس کہانی کی معنویت کا راز یہی ہے کہ اس میں چاند گرہن اور اس سے متعلق اساطیری روایات کا استعمال اس خوبی سے کیا گیا ہے کہ کہانی کی واقعیت میں ایک طرح کی مابعد الطبیعاتی فضا پیدا ہو گئی ہے۔''

مظفر علی سید نے اپنے مقالہ ''گرہن'' کے تجزیاتی مطالعے میں کئی بنیادی سوالات اٹھائے ہیں اور اس وقت تک کی کئی مسلمہ رائیوں سے انحراف اور اختلاف کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ افسانے میں چھپی ہوئی معنویت کو نمایاں کرنے کا یہ مفہوم تو نہیں ہونا چاہیے کہ خود افسانہ ہی اس کے بوجھ تلے پس کر رہ جائے۔ ان کا خیال ہے کہ:

''گرہن'' اردو کی بہترین کہانیوں میں سے ایک ہونے کی بجائے محض ایک بیج سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور یہ وہ بات ہے جسے بیدی کا ہمدرد سے ہمدرد ناقد بھی کہے تو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر بعد میں بیدی نے کسی جگہ کوئی ایسا مقام حاصل کر لیا ہے جو اس تعریف کا مستحق ہو کہ 'خارجی حقیقت میں آفاقی حقیقت یا محدود میں لامحدود دیکھنے کی یہی خصوصیت جو گرہن میں ایک بیج کی حیثیت رکھتی ہے، آزادی کے بعد بیدی کی کہانیوں میں ایک مضبوط اور تناور درخت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔ تو پھر یہ ماننا پڑے گا۔'' (بقیہ ص ۲۴ پر)

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

اکیسویں صدی میں بہار کے اردو ناول

آل احمد سرور نے کہا تھا کہ کسی ملک کے رہنے والوں کے تخیل کی پرواز کا اندازہ وہاں کی شاعری میں ہوتا ہے، مگر اس کی تہذیب کی روح اس کے ناولوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسانی زندگی جس شکست وریخت، پیچ وخم اور انقلاب سے دوچار رہتی ہے اس کے اظہار کا سب سے بہتر وسیلہ بننے کی صلاحیت اگر کسی صنف میں ہے تو وہ صرف ناول میں ہے، کیونکہ ناول معاشرہ، فرد اور ذات کے نہ صرف خارجی عوامل وعناصر کو پیش کرتا ہے بلکہ داخلی تضاد وتصادم اور اس کے محرکات کو بھی اپنی گرفت میں لیتا ہے۔

زندگی اور معاشرے سے گہرے تعلق کے باوجود ناول کو اپنے وجود اور اہمیت کے لئے ہر جگہ اور ہر دور میں سنگھرش کرنا پڑا ہے۔ پریم چند کے ''گئودان'' تک ناول کو بڑی مشکل سے تیسرا درجہ دیا گیا تھا۔ (اس سے پہلے کے دو مقام شاعری اور افسانے کے لئے مخصوص تھے) ترقی پسند تحریک اور تقسیم ہند کے زیر اثر لکھنے والوں نے اردو ناول نگاری کو موضوع اور اظہار دونوں سطحوں پر نئے موڑ اور نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ ان لوگوں کے ذریعہ ناول میں پہلی مرتبہ نئی کہانی، اس کے کہنے کا فن، وقت اور اس کا انسانی زندگی میں عمل دخل، نفسیاتی، سماجی اور طبقاتی الجھنیں، اظہار کی نئی صورتیں سب کچھ نئے مسائل کے ساتھ نئے ڈھنگ سے پیش ہوئے۔ انہیں تمام صورتوں نے ناول کے لئے ایک راستہ ہموار کیا اور ناول محض اصلاحِ مذاق، دل بہلاؤ اور مثالی زندگی کی تلاش سے نکل کر حقیقی اور عملی زندگی کی طرف متوجہ ہوا۔

زندگی اور سماج سے بڑھتے ہوئے تعلق نے ناول کی مقبولیت میں بھی اضافہ کیا اور ناول جو اصناف ادب میں تیسرے درجے پر متمکن تھا اسے دوسرا مقام مل گیا۔ پہلا مقام حاصل کرنے کے لئے بہر حال اسے سنگھرش کرتے رہنا تھا کیونکہ ۱۹۷۰ء کے بعد تک جب نئی نسل کی آمد کی اطلاع اور بحث زوروں پر تھی، فکشن میں اس کا ذکر صرف افسانوں کے حوالے سے ہوتا تھا۔ ناول کی سمت ورفتار قرۃ العین حیدر (گردش رنگ چمن) سے جوگیندر پال (نادید) تک آکر رک سی گئی تھی اور یہ اندیشہ ظاہر کیا جانے لگا کہ ناول کے لئے ایک خاص قسم کے تجربے، مشاہدے اور عمر کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور یہ سب نئی نسل کے پاس نہیں، اس لئے یہ مشکل اور بڑا کام نئی نسل کے بس کا نہیں۔ گویا ۱۹۷۰ء کے بعد ہمارے نقادوں کے ذریعہ ناول کے سفر پر فُل اسٹاپ لگانے کی کوشش کی جانے لگی تھی۔

کرائسس سے بھرے اس عہد اور ماحول میں بہار سے تعلق رکھنے والے تین اہم افسانہ نگاروں عبدالصمد، غضنفر اور پیغام آفاقی کے بالترتیب تین ناولوں ''دوگز زمین''، ''پانی'' اور ''مکان'' نے فکشن کی دنیا میں ہلچل مچا دیا۔ اس ہلچل کی دو وجہیں اور تھیں ایک تو یہ کہ خلاف توقع یہ ناول نئی نسل، نئی ذہن کی پیداوار تھے، دوسری وجہ ان کا رویہ برتاؤ اور اسلوب قطعی طور پر اپنے پیش روؤں سے مختلف تھے۔ یہ ناول سبھی کو چونکا گئے۔ ان ناولوں کی کامیابی نے دوسرے علاقوں کے لکھنے والوں کے علاوہ خود بہار کے اہم افسانہ نگاروں کو بھی متوجہ کیا، چنانچہ یکے بعد دیگرے متعدد ناول منظر عام پر آتے گئے، اور یہ سلسلہ اکیسویں صدی میں بھی جاری ہے۔ حسین الحق، عبدالصمد، غضنفر، شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، الیاس احمد گدی، شفق، محمد علیم، کوثر مظہری، آچاریہ شوکت خلیل، احمد صغیر، علی امجد، ظفر عدیم اور شبر امام وغیرہ ایسے نام ہیں جن کا سب سے بڑا Contribution یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں انہوں نے ناول کو پہلے پائیدان پر پہنچا دیا اور آج نقادوں کو مجبور کر دیا یہ اعلان

کرنے پر کہ اکیسویں صدی اردو فکشن بالخصوص اردو ناول کی صدی ہے۔

اکیسویں صدی میں بہار کے ناول نگاروں کے ذریعہ جو ناول منظر عام پر آئے ان میں مجھے ''میر کہتے ہیں صاحبو'' (حبیب حق) ''دھمک''، ''بکھرے اوراق''، ''شکست کی آواز'' (عبدالصمد) ''مہاماری''، ''اے دل آوارہ'' (شموئل احمد) ''وش منتھن''، ''شوراب''، ''مانجھی'' (غضنفر) ''پلیتہ'' (پیغام آفاقی) ''جنگ جاری ہے''، ''دروازہ بند ہے''، ''ایک بوند اجالا'' (احمد صغیر) ''پوکے مان کی دنیا''، ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان''، ''لے سانس ابھی آہستہ''، ''آتش رفتہ کے سراغ''، ''نالہ شب گیر'' (مشرف عالم ذوقی) ''بادل''، ''کابوس'' (شفق) ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' (محمد علیم) ''اگر تم لوٹ آتے'' (آچاریہ شوکت خلیل) ''دھند میں کھوئی ہوئی روشنی'' (افسانہ خاتون) ''ایک اور کوسی'' (نسرین ترنم) ''دھند میں اُگا پیڑ'' (آشا پربھات) ''انجو شوفر'' (ظفر عدیم) ''شاہین''، ''جب گاؤں جاگے'' (شبر امام) ''کالی ماٹی'' (علی امجد) ''سیاہ کاری ڈور میں ایلین'' (جاوید حسن) اور ''لیمینیٹڈ گرل'' (اختر آزاد) وغیرہ اہم ہیں۔

بلاشبہ بہار سے تعلق رکھنے والے یہ تمام ناول غیر معمولی اور اہم نہیں ہیں مگر ''دھمک''، ''مہاماری''، ''مانجھی''، ''جنگ جاری ہے''، ''لے سانس بھی آہستہ''، ''بادل'' اور ''لیمینیٹڈ گرل'' جیسے کچھ ناول ایسے ضرور ہیں جو اردو ناول کی تاریخ کا حصہ بنیں گے۔ یہ ناول اہم بھی ہیں اور اچھے بھی کیونکہ ان میں جیتے جاگتے تازہ ترین مسائل، دور حاضر کی سماجی اور معاشی گتھیاں، زندگی کی نئی الجھنیں، انسان کی نفسیاتی کمزوریاں، نئے اور منفرد انداز میں در آئی ہیں۔ میڈیا کا پھیلتا جال، بھرشٹاچار کا کھل کر کھیل، فرقہ وارانہ فسادات، نیا عریاں کلچر، نوجوانوں کا بڑھتا ہوا فرسٹریشن، تعصب، بہار کی مخصوص سیاست اور اس کا بحران، اقدار کی پامالی اور ہوس کی اجارہ داری جیسے مختلف موضوعات ان ناولوں میں زندگی کی پوشیدہ تلخ اور کھردری حقیقتوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ زندگی کے انتشار اور اس کے احساس نے کبھی کبھی پلاٹ سے بھی لکھنے والوں کی دلچسپی کم کردی۔ انسان کے باطنی کرب اور زندگی کی بے سمتی کا اظہار بھی ان ناولوں میں ہوا اور اسی مناسبت سے زبان و اسلوب بھی اختیار کئے گئے اس لئے ان ناولوں میں لسانی تازہ کاری کو بڑی آسانی سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہاں مسائل کا حقیقی عرفان و ادراک، تبدیل شدہ اقدار و افکار کا حقیقت پسندانہ و فنکارانہ اظہار و ابلاغ اپنے آپ میں گہری بصیرت اور جمالیاتی کیف رکھتا ہے۔ اس لئے بہار کے یہ ناول اپنی گوناں گوں خصوصیات کے ساتھ ساتھ ایسے مختلف جدید رویے اور نئی جہتیں پیش کرتے ہیں جن سے اردو ناول کا دامن وسیع ہوتا ہے اور گفتگو کے نئے دروازے کھلتے ہیں۔

اکیسویں صدی میں بہار کے اہم ناول نگاروں میں جن لوگوں نے تسلسل کے ساتھ ہمیں ناول دیے ہیں، اُن میں عبدالصمد، ذوقی، غضنفر اور احمد صغیر سب سے پہلے متوجہ کرتے ہیں۔ عبدالصمد اپنی سیاسی فکر اور واضح بیانیہ اسلوب کے سبب پہلے سے ہی شناخت قائم کر چکے تھے، نئی صدی میں انہوں نے ''دھمک''، ''بکھرے اوراق'' اور ''شکست کی آواز'' جیسے ناولوں میں اپنے موضوعاتی اور اسلوبی تنوع کے سبب قارئین کو چونکایا۔ ''دھمک'' میں انہوں نے بدعنوان سیاست کی پیچیدگیوں، اقتدار کے کھیلوں اور استحصال کے بھیانک رنگوں کو تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنے صوبے بہار کے سیاسی گلیاروں اور اس کے شب و روز کا گہرا مشاہدہ کیا اور اس کے اندھیروں اجالوں کو بڑی سادگی و بے تکلفی سے پڑھنے والوں تک پہنچا دیا۔

سیاست اور سماج عبدالصمد کا پسندیدہ موضوع رہا ہے اس لئے انہوں نے ناول میں بہار کے سیاسی کھیل، کرپشن اور شرمناک سرگرمیوں کے مختلف رنگوں کو کئی زاویوں سے پوری فنکاری کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ چونکہ عبدالصمد کے تمام ناول ایک تخصیص لیے ہوئے پس منظر اور اسلوب کے حامل ہوتے ہیں اس لیے ''بکھرے اوراق'' اور ''شکست کی آواز'' نے قارئین کو اسلوب اور موضوع کی ندرت کی وجہ سے حیران کردیا۔

''بکھرے اوراق'' موضوع کے اعتبار سے تو وہی سیاسی اور معاشرتی کرپشن پیش کرتا ہے جس کے لیے عبدالصمد مشہور ہیں۔ اس میں بھی انہوں نے خوف و دہشت کے موجودہ ماحول کو ہمہ جہت رنگ میں دیکھنے دکھانے کی کوشش کی ہے، مگر یہاں ان کا اسلوب استعاراتی اور

علامتی ہے۔ عبدالصمد شروع میں اپنے استعاراتی اور علامتی افسانوں کے لیے خاصے مشہور رہے ہیں، مگر ناول میں انہوں نے یہ انداز پہلی مرتبہ اختیار کیا ہے۔ یہ اسلوب ناول میں بہت کامیاب تو نہیں ہو سکا، مگر اس کے ذریعہ انہوں نے ناول کو ہماری موجودہ زندگی کا آئینہ خانہ بنانے میں کامیابی ضرور حاصل کی ہے۔

عبدالصمد کا ناول ''شکست کی آواز'' اسلوب کے بجائے موضوع کے سبب حیران کرتا ہے کہ اس میں عبدالصمد پہلی بار سیاسی اور سماجی گلیاروں سے نکل کر انسان کے نفسیاتی اور جنسی مطالعے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ انہوں نے ندیم نام کے ایک Introvert نوجوان کی شخصیت میں پوشیدہ جنسی شعور کی پیچیدگیوں کو وقوعوں کے ذریعہ تدریجی طور پر نہایت کامیابی سے دکھایا ہے۔ ندیم چونکہ فطری طور پر دروں بیں (Introvert) ہے، وہ لڑکیوں سے گھبراتا ہے۔ طبعیاتی تقاضے کے تحت جنسی جذبے کی فزوں تری ندیم کی شخصیت میں ایک کشاکش پیدا کرتی ہے۔ وہ نوری کو نیم عریاں انداز میں دیکھتا بھی ہے، مگر جب وہ اپنا جسم دکھانے لگتی ہے تو گھبرا بھی جاتا ہے۔ ناظمہ قریب آنے لگتی ہے تو خود فاصلہ قائم کر لیتا ہے، مگر یہی جذبہ اس وقت بیبا کی محسوس کرتا ہے جب وہ نوری کو ماسٹر کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ جب یہ باندھ ٹوٹتا ہے تو وہ اپنے اندر ہمت بٹور لیتا ہے کہ عورت کو مختلف روپ میں دیکھ سکے۔ اختری کا آنا، بچے کو دودھ پلانا، پھر غسل خانہ میں نہانا، یہ ساری تصویریں ندیم کی شخصیت میں پوشیدہ برف کی سل کو پگھلاتی رہتی ہیں اور تصورات اور حقیقت کا ٹکراؤ اُسے آگہی کی نئے جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔ عبدالصمد نے ندیم کی آہستہ خرام تبدیلیوں کو متعدد چھوٹے چھوٹے خارجی واقعات کے ذریعہ فطری انداز میں پیش کیا ہے۔ شخصیت اور اس کی دروں بینی کی نفسیات کا گہرا مطالعہ اِس ناول کا اہم ترین وصف ہے جو عبدالصمد کی ناول نگاری کی ایک نئی، مگر دلچسپ جہت سے روشناس کراتا ہے۔

بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں سیاست اور اس کے نتیجے میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمانوں کو ٹارگٹ کرنے کا مسئلہ بھی اپنے وطن کے بڑے مسائل میں شمار ہوتا رہا ہے۔ اب تہذیبوں کا ٹکراؤ آمنے سامنے ہے، اس لیے معمولی معمولی باتوں پر فرقہ وارانہ تناؤ ہو جاتا ہے۔ غلط فہمیوں اور سیاسی مفادات سے نفرت کی آگ کو ہوا ملتی ہے اور ایک مخصوص طبقے کو دہشت گردی کا نشانہ بنا کر پوری قوم پر خوف و ہراس کی فضا مسلط کر دی جاتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے ''آتش رفتہ کا سراغ''، پیغام آفاقی کے ''پلیتہ''، احمد صغیر کے ''دروازہ ابھی بند ہے''، شموئل احمد کے ''مہاماری''، شفق کے ''بادل''، ''کابوس'' اور محمد علیم کے ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' میں خوف و دہشت کی وہ فضا بہ آسانی دیکھی جا سکتی ہے جو ناانصافیوں کی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔

''مہاماری''، ''پلیتہ''، ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' کا موضوع بنیادی طور پر ملک کی موقع پرست اور قابل مذمت سیاست ہی ہے۔ وہ سیاست جس نے دفتر شاہی، بدعنوان پولس اور انتظامیہ سے ہاتھ ملا کر ایک ایسا سسٹم پیدا کر دیا ہے جس سے نکلنا کسی ایماندار فرد کے لیے محال ہے۔ ان ناولوں کے کردار ایک طرف مفاد پرست لیڈروں کی آئینہ داری کرتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ ہماری مشترکہ تہذیب نیم جاں ہو چکی ہے اور سیاست اور مذہب کا گٹھ جوڑ اِس تہذیب کی پروردہ ایک پوری نسل کو بے ضمیر بنانے پر آمادہ ہے۔ فرقہ واریت سیاست کو کیسے طاقتور بناتی ہے، تحریک کیسے گھٹنے ٹیک دیتی ہے، ہتھیلیاں کیسے عزائم خریدتی ہیں اور جنسی استحصال کس طرح سرور بخشتا ہے، ان سب کو شموئل احمد نے بڑی سچائی اور بے باکی سے ''مہاماری'' میں پیش کیا ہے تو فیمنزم، مارکیٹ اکانومی، گلوبلائزیشن، کرپشن، کارپوریٹ کلچر، پولرائزیشن، بدامنی اور ذہنی دیوالیہ پن اور لاقانونیت کی واضح تصویریں پیغام آفاقی نے ''پلیتہ'' میں پیش کی ہیں۔ ''میرے نالوں کی گمشدہ آواز'' میں بھی انہیں حقائق پر نظر ڈالی گئی ہے، مگر بہار کے ایک چھوٹے سے شہر کے حوالے سے جو آہستہ آہستہ پھیل کر پورے ملک کی کہانی بن جاتی ہے۔

اس دور کی پیچیدہ سیاست اور نئی صدی میں مسلمانوں کی صورت حال پر قدرے وسیع کینوس کے ساتھ مشرف عالم ذوقی اور شفق نے بھی لکھا ہے۔ شفق نے ''بادل'' میں موجودہ عہد کے مسلمانوں کی بے چینی اور عالمی سطح پر جنگ اور فساد کے بڑھتے ہوئے رجحان سے پیدا شدہ

مسائل و نتائج پر روشنی ڈالی ہے۔ ناول ۱۱ستمبر ۲۰۰۱ء کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر ہوئے حملہ سے شروع ہوتا ہے اور اس ہیبت ناک حادثے کی تفصیل ٹی وی پر دیکھتے ہوئے لوگوں کے مختلف خیالات پر نظر ڈالتا، ہندستانی مسلمانوں کی زندگی اور ان کے موجودہ رویے کو ٹٹولتا آگے بڑھتا ہے۔ اِس حادثے نے مسلمانوں کو جس فکر اور اندیشے میں مبتلا کر دیا اور جن سوالات سے انہیں جوجھنا پڑا، ناول ان کا جائزہ بڑے مدلل انداز میں لیتا ہے اور حملے کے بعد مسلمانوں کو درپیش مسائل کو بڑے کرب اور دکھے دل سے پیش کرتا ہے۔ یہ موضوع ایسا تھا کہ ناول خبروں کا پلندہ بن جاتا، مگر مصنف نے شعور کی پختگی اور فنکاری سے کام لے کر اسے ناول ہی بنائے رکھنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

مشرف عالم ذوقی کو موضوعاتی ناول لکھنے میں مہارت حاصل ہے۔ وہ بے باکی اور نڈرتا سے دیش، سماج، معاشرے، تہذیب وتمدن اور انسانیت کے بنتے بگڑتے نقوش کو نہ صرف اپنی تیز آنکھوں سے دیکھتے ہیں، بلکہ اس کرب کو دل میں اتار لیتے ہیں، اور پھر ان کا قلم اپنے موضوع کے ساتھ بھرپور طریقے سے انصاف کرتا ہے، اسی لیے ذوقی کے یہاں موضوعاتی تنوع بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ''گزشتہ صدی میں بیان''، ''شہر چپ ہے'' اور ''ذبح'' جیسے ناول پیش کرنے کے بعد نئی صدی میں بھی وہ ''پوکے مان کی دنیا''، ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان'' وایا ''سونامی''، ''لے سانس بھی آہستہ''، ''آتش رفتہ کے سراغ'' اور ''نالہ شب گیر'' جیسے کئی ناول ہمیں دے چکے ہیں۔

''پوکے مان کی دنیا'' نئی نسلوں اور نئی تہذیب کی افسوسناک تصویریں پیش کرتا ہے، جہاں فلم، ٹی وی، کمپیوٹر اور کارٹون بچوں کی زندگی کا حصہ بن گئے ہیں اور ایک نئی صارفیت زدہ، ہوس کی اجارہ داری کرنے والی تہذیب پیدا کر رہے ہیں۔ ناول میں ذوقی کا اصل Concern بچے ہیں، جو فنتاسی اور رئیلیٹی کے بیچ پھنس کر ریپ جیسے مذموم حادثے انجام دے رہے ہیں۔ پوکے مان کارڈز، کارٹون اور ویب سائٹس بچوں سے ان کا بچپن چھین رہے ہیں۔ فنتاسی کے غلط استعمال پر ذوقی کا غصہ آتش فشاں بن جاتا ہے اور وہ اپنا سارا زورِ قلم اپنی تہذیب اور بچوں کی معصومیت کو بچانے میں صرف کر دیتے ہیں۔

''پروفیسر ایس کی عجیب داستان'' (۲۰۰۵ء) میں بھی ذوقی نے موجودہ عہد کی سماجی، سیاسی، مذہبی اور فکری نا انصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا ہے، مگر اس کا ذمہ دار ''وقت'' کو بنایا ہے، جو بھیانک طوفان سونامی کی طرح ہماری قدروں، تہذیبوں، ثقافتوں اور ایمانداریوں کو بہالے جارہا ہے۔

''لے سانس بھی آہستہ'' تہذیب کے ٹوٹنے، بکھرنے کی ایک اور داستان پیش کرتا ہے، جس میں تین نسلوں کے سفر نے تین تہذیبوں کا راستہ طے کیا ہے۔ عبدالرحمٰن کا کردار، اس کے آباؤ اجداد اور اس کے بعد کی نئی نسل۔ تہذیب کے زوال سے سماج کا چہرہ کس حد تک کریہہ ہوسکتا ہے اس کی بھیانک تصویر مصنف نے ''لے سانس بھی آہستہ'' میں پیش کی ہے۔

''آتش رفتہ کا سراغ'' آزادی کے بعد ہندستان میں مسلمانوں کی آپ بیتی یا سرسٹھ سالہ دردناک تاریخ ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک ذوقی نے اپنے سینے میں جلنے والے درد و کرب کی اس آگ کو انڈیلا ہے جو انہیں جلا رہی تھی۔ ۷۲۰ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم ناول تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ۲۰۰۸ء تک کے وہ واقعات ہیں جن میں مسلمانوں کو اس انداز سے دہشت زدہ کیا گیا کہ وہ اپنے ہی ملک میں خود کو غریب الوطن سمجھنے لگے۔ بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر اس کی سب سے بڑی مثال تھی۔ مسلمانوں کا مذہبی لباس، داڑھی، ٹوپی، اُن کے دہشت گرد ہونے کی علامت بنا کر انہیں بدنام کیا جانے لگا۔ ناول کا دوسرا حصہ اس زمانے کو پیش کرتا ہے، جب بابری مسجد رام مندر ایودھیا کی تحریک چل رہی تھی اور فرقہ پرست عناصر مسلمانوں کے درمیان نفرت کی تخم ریزی کر رہے تھے، جب کہ تیسرا حصہ ۲۰۱۰ء کے بعد کے مسلسل واقعات کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔

ذوقی کے یہ تمام ناول اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کے یہاں احتجاج کا ایک ایسا انداز ملتا ہے جو دورِ حاضر کے بہت کم ناول نگاروں کے یہاں دکھائی دیتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خود انہوں نے کوئی حرف شکایت بھی زبان پر نہیں لایا بلکہ آئینہ دکھا کر ایک سوالیہ نشان ہمارے سامنے کھڑا کر دیا۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ جھنجھلائیں، غصہ کریں،

خاموش رہ جائیں یا سرگرم عمل ہو جائیں۔ تقسیم ہند سے لے کر آج تک سیاست کے سبب ہماری زندگی اور تہذیب پہ نشیب و فراز آتے رہے ہیں اور بجلیوں کی زد پہ ہمارا آشیانہ مسلسل رہا ہے، اس لیے صدائے احتجاج بلند ہونا ایک فطری امر ہے، مگر یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ذوقی کی صدائے احتجاج دوسروں کی آواز سے قطعی مختلف اور زیادہ موثر ہے۔

اکیسویں صدی میں تسلسل کے ساتھ ہمیں ناول دینے والے ایک اہم ناول نگار غضنفر بھی ہیں۔ انہوں نے "وش منتھن"، "شوراب" اور "مانجھی" کی صورت میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی دونوں سطحوں پر ناولوں میں تنوع پیدا کیا ہے۔ غضنفر کا آزمودہ اسلوب اور مخصوص طریق کار استعاراتی، علامتی اور تمثیلی رہا ہے۔ "وش منتھن" میں انہوں نے ہندو مسلم تعلقات، اختلافات اور تصادمات کو اپنے آزمودہ استعاراتی، تمثیلی اور شعری اسلوب ہی میں برتا ہے۔ جب کہ "شوراب" حیرت انگیز طور پر واضح بیانیہ اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد "مانجھی" میں پھر وہ اپنے استعاراتی اور علامتی طرز اظہار کی طرف واپس لوٹ گئے ہیں۔

"مانجھی" کا ہیرو وی۔ این رائے اپنے رشتے کے بھائی کے گھر الہ آباد آتا ہے۔ دونوں بھائی کے نظریات و خیالات میں تضاد ہے۔ وی۔ این رائے سنگم کی سیر کے لیے جس ناؤ کا انتخاب کرتا ہے اس کے مانجھی کا نام ویاس ہے۔ یہ ناول وی۔ این رائے اور مانجھی ویاس کے مکالموں پر مبنی ہے۔ ان دونوں کی گفتگو میں آج کی دنیا کے حالات، مذہب، سیاست، ہندو صنمیات اور مختلف معاشرتی مسائل بھی آتے ہیں۔ اس ناول میں واقعات قصے کی شکل میں نہیں آتے بلکہ سارے واقعات، مشاہدات یا تصورات کی شکل میں آتے ہیں۔ غضنفر تجربہ پسند ذہن رکھتے ہیں، انہوں نے سابقہ ناولوں کی طرح اس میں بھی اشاراتی اسلوب کا تجربہ کامیابی کے ساتھ برت کر فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔

"شوراب"، "مانجھی" سے قبل شائع ہوا، مگر مانجھی سے زیادہ مقبول ہوا۔ اول تو اپنے واضح بیانیہ اسلوب کی وجہ سے اور دوم موضوع کی ندرت کے سبب۔ "شوراب" کے حوالے سے مصنف نے تلاش رزق میں دربدری یا ہجرت کو موضوع بنایا ہے۔ اپنے ملک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود نوکری حاصل کرنے میں ناکام رہنے والے نوجوان خلیجی ممالک کا رخ کرتے ہیں اور وطن سے دوری، نت نئے مسائل کو جنم دیتی ہے۔ وہ زندگی بھر اپنے کرب کی آگ میں تنہا جلتے ہیں اور خوبصورت تحفے عزیزوں یا دوستوں کی نذر کرتے ہوئے یہ تمنا ہی کرتے رہ جاتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں کے چھالے بھی کوئی دیکھ لیتا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا غضنفر، اپنے استعاراتی اور علامتی طرز بیان کے لیے مشہور ہیں، مگر حیرت انگیز طور پر انہوں نے یہ ناول پوری طرح بیانیہ میں لکھا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر غیر ضروری طور پر بعض تمثیلی قصوں کو بھی انہوں نے کہانی کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس ناول میں ایک اور چیز بار بار نگاہوں میں چبھتی ہے، وہ ہے جنسییت کا غلبہ۔ کئی مقام پر سستی جذباتیت، بیانیہ کی عریانیت اور جزئیات نگاری غیر ضروری طور پر درآئی ہیں۔ اسی موضوع پر احمد صغیر کا ناول "ایک بوند اجالا" بھی قابل قدر ہے جس میں مصنف نے تخلیقی سطح پہ کمال کی بنت اور فنکاری سے کام لیتے ہوئے اس عورت کی بغاوت کا نفسیاتی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس کا شوہر اسے چھوڑ کر عرب ملک میں روزی کمانے گیا ہوا ہے۔ کسی کمزور لڑکی کے لیے اس اذیت کو سہ جانا شاید آسان ہوتا ہو، لیکن عام طور پر پڑھی لکھی لڑکیوں میں تکلیف دہ تنہائی، جسمانی و روحانی اذیت اور گھٹن سے گھبرا کر بغاوت کا مادہ سر اٹھانے لگتا ہے اور یہی اس ناول کی ہیروئن کے ساتھ ہوتا ہے، وہ اُس ایک بوند اجالے کے لیے بغاوت کرتی ہے۔ ناول میں مذہب بھی ہے اور نئی تہذیب بھی اور انسانی فطرت کے حوالہ سے بغاوت کا منظر نامہ بھی۔ مصنف نے بڑی خوبصورتی سے اس نازک موضوع کو برتا ہے، اس لیے انسانی نفسیات کی مختلف پرتیں ہمیں ایک منجھے ہوئے فنکار کی طرح دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ احمد صغیر "جنگ جاری ہے" اور "دروازہ بند ہے" میں اکیسویں صدی کے ہندستان اور مسلمانوں کی لرزہ خیز داستان سنا کر قارئین کے دلوں میں جگہ بنا چکے تھے، اِس ناول کے ذریعہ انہوں نے موضوع بدل کر ہمیں اپنی فنکاری سے روشناس کرایا ہے۔

آخر میں تین، چار ناولوں کا اور ذکر کرنا چاہتا ہوں، جن میں نئی صدی اور نئی تہذیب میں عورتوں کی پوزیشن، ان کے استحصال اور پدرانہ نظام معاشرت کے جبر کا بیان ہے۔ پہلا ناول اختر آزاد کا "لیمینیٹڈ

گــرل ’’ ہے جوسب سے پہلے ہمیں اپنے نئے موضوع کی وجہ سے متوجہ کرتا ہے۔ اکیسویں صدی کی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی صارفیت نے ہر شئے کو بازار کا سامان بنادیا ہے۔ یہاں تک کہ ’’عورت‘‘ بھی اب گوشت پوست کے بجائے پلاسٹک کو ڈیڈ چمچماتی ہوئی چیز بن کر رہ گئی ہے۔ عورت کو اس مقام تک لانے میں جہاں اس کی اپنی بے راہ روی، فیشن اور دولت کی فراوانی کا ہاتھ رہا ہے وہیں فلموں اور ٹی وی پروگراموں نے بھی اہم کردارادا کیا ہے۔ اختر آزاد نے بڑی فنکاری سے اس ناول میں ایک ماں کواپنی بیٹی کوٹی۔وی کے رئیلیٹی شوز کے لیے تیار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ شوبھا اپنی بیٹی کوٹریننگ سے سلیکشن اور پھر کامیاب T.V.Face بنانے کے لیے ہر جائز وناجائز امتحان سے گزرتی ہے۔ یہی نہیں وہ بیٹی کے ذہن میں بھی سرایت کردیتی ہے کہ شہرت، دولت اور سماجی status کے لیے ہر کام جائز ہے۔ ماں بیٹی شہرت کی بلندیاں تو پالیتی ہیں، مگر بالآخر وہی ہوتا ہے جو ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے۔ اس کے باپ ڈاکٹر کپل کی مثبت فکر بہر حال فتح حاصل کرتی ہے۔ مصنف نے اپنی فنی مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ناول کا اختتام کیا ہے جس سے قاری کے ذہن پر واضح تاثر قائم ہوتا ہے کہ ایسے رئیلیٹی شوز معاشرے میں متعدد برائیوں کو جنم دینے کا سبب بن رہے ہیں۔

اپنے موضوع کی ندرت کے سبب نیلوفر کا پہلا ناول ’’اوٹرم لین‘‘ بھی ہمیں متوجہ کرتا ہے جس میں مصنفہ نے یو پی ایس سی کی تیاری کرنے والے طلبہ کے جدوجہد، کوچنگ انسٹی چیوشنز کی لوٹ کھسوٹ اور ناکامی کے بعد پیدا ہونے والے فرسٹریشن کو بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اگر چہ یہ ناول فنی طور پر ادب میں جگہ بنانے میں ناکام رہا، مگر قدروں کی پامالی اور تہذیب کے زوال سے الگ نئی صدی میں لکھنے والے نئے موضوعات کی طرف جس طرح راغب ہورہے ہیں اس کا اشاریہ ضرور ہے۔

عورتوں کے ناول اور عورت کے مسئلے پر بات کرتے ہوئے مجھے بہار کے دو ناول اور یاد آرہے ہیں۔ آشا پربھات کا ’’دھند میں اُگا پیڑ‘‘ اور افسانہ خاتون کا ’’دھند میں کھوئی ہوئی روشنی‘‘ گرچہ ان دونوں کے موضوعات براہ راست تانیثیت کی تحریک سے تعلق نہیں رکھتے، مگر عورتوں کے استحصال، معاشرتی جبر اور عورتوں کے اضطراب سے ان کا تعلق ضرور ہے۔ عورت کے اندر پھوٹنے والے سب سے خوبصورت جذبے پر خود عورت کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا ضمیر تو محبت کی مٹی سے گندھا ہوتا ہے، مگر پدرانہ سماج میں عورت کو ہی مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ ’’دھند میں اگا پیڑ‘‘ ایک شادی شدہ عورت کی داستان ہے جس میں اس کا خود غرض، شاطر اور منصوبہ بندی کے ساتھ جرم کرنے والا شوہر نہ صرف پیش قدمی کرتا ہے بلکہ کامیاب بھی ہوجاتا ہے، لیکن ہر حال میں عورت ہی مورد الزام ٹھہرائی جاتی ہے۔ آشا پربھات نے شادی شدہ عورت کے عشق اور مرد و عورت کے رشتوں پر سادگی کے ساتھ عمدہ کہانی بیان کی ہے، جب کہ افسانہ خاتون نے اپنے ناول میں شالینی، سنتوش اور سمیر سے جو تکون تیار کیا ہے، اس کے ذریعہ ازدواجی رشتے کے کھوکھلے پن اور تشنگی کے درمیان عورت کی ذہنی و جذباتی کشمکش کو بخوبی بیان کرکے اپنی شناخت بنانے کی کوشش کی ہے، مگر ناول کے آخری حصے میں کلائمکس اور اینٹی کلائمکس کے مابین عجلت پسندی نے فنی سالمیت کو نقصان پہنچایا ہے۔

عورتوں کے ایسے ہی چند ناولوں کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر اعجاز علی ارشد نے ایک سوال اٹھایا تھا کہ:

> ’’عورتوں کا اضطراب فطری ہے، مگر ہمیں آج بھی اردو ناول میں اس نسوانی کردار کی تلاش ہے جو مردوں کی صرف شکایت نہ کرے بلکہ ان کے سامنے سوالیہ نشان کی صورت میں ابھرے۔‘‘

میرا خیال ہے کہ ذوقی کا نیا ناول ’’نالہ شب گیر‘‘ نہ صرف اُن کے سوال کا جواب ہے بلکہ اُس نسوانی کردار کو بھی پیش کرتا ہے جس کی تلاش اردو ناول کے ناقدوں کو رہی ہے۔ ناہید اس ناول کا وہ کردار ہے جس نے نہ صرف ظلم سہنے سے انکار کیا بلکہ برسوں کی تذلیل کا بدلہ لینے کی بھی ٹھان لی، جو نہ صرف اپنی سوچ بدل لیتی ہے بلکہ اِس نئی صدی کو بدل دیتی ہے۔

اردو ناول نے آج تک ممتا، قربانی اور محبت کے جذبوں سے بھرپور عورت کو ہی دکھایا تھا، ذوقی نے ہمیں وہ عورت دکھایا ہے جس کے اندر ہر غلط نگاہ کو نوچ لینے کی ہمت ہے۔ ذوقی نے ایک نئی عورت کا تصور پیش کیا ہے جو مردوں سے کسی طرح کمتر نہیں، بلکہ جس نے کمال

ہشیاری سے مردوں کو ہی عورت بنا دیا ہے۔ بلا شبہ یہ ناول فیمنزم کے حوالے سے نہ صرف ایک نئی سوچ کے ساتھ فکر و احساس کے نئے دریچے وا کرتا بلکہ ذوقی کی ناول نگاری کی نئی اور کامیاب جہت سے آشنا کراتا ہے۔

مجھے احساس ہے کہ اکیسویں صدی میں بہار کے ناولوں کا یہ تذکرہ مزید چند ناولوں کے تفصیلی ذکر کا متقاضی ہے مثلاً ''اگر تم لوٹ آتے'' (آچاریہ شوکت خلیل) ''ایک اور کوسی'' (نسرین بانو) ''انجو''، ''شوفر'' (ظفر عدیم) ''شاہین''، ''جب گاؤں جاگے'' (شبر امام) ''کالی ماٹی'' (علی امجد) ''سیاہ کاری ڈور میں ایلین'' (جاوید حسن) ''آنکھ جو سوچتی ہے'' (کوثر مظہری) ''پلیتہ'' (پیغام آفاقی) ''کابوس'' (شفق) ''یادوں کے سائے'' (خورشید انور ادیب) اور ''آخر کب تک'' (اقبال نظامی) اور ''دل آوارہ'' (شموئل احمد) وغیرہ۔ ان تمام ناولوں کے مطالعے سے ایک بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ بیسویں صدی کے اواخر میں بہار نے اردو ناول کی طرف جو پیش قدمی کی تھی وہ اکیسویں صدی میں بھی قائم رہی ہے۔ اکیسویں صدی میں بہار کا اردو ادب مجموعی طور پر ناول کی طرف زیادہ سنجیدگی سے متوجہ ہوا ہے اور اس دوران ناول نگاری کو عروج بھی حاصل ہوا ہے، بلکہ پورے ہندستان میں اردو ناول کی رفتار میں تیزی لانے کا کام بہار کے ناول لکھنے والوں نے ہی کیا ہے کیونکہ اردو ناول لکھنے والوں کی جو تعداد ہندوستان میں موجود ہے اس کا بڑا حصہ بہار سے تعلق رکھتا ہے۔

بہار کے ناول نگاروں نے اکیسویں صدی کی موجودہ زندگی کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ شاید ہی عوام و خواص کی زندگی کی کوئی صورت ان کی گرفت اور اظہاریت سے چھوٹی ہو۔ آج کی رنگا رنگ زندگی، معاشرے پر مغربی دباؤ اور اثرات، معاشی صورتیں، نفسیاتی پیچیدگیاں، جنسی اور سیکسی رویے، سیاست کے داؤں پیچ، استحصال کے نئے نئے روپ اور ہر پل نئے تجربات سے دوچار ہوتا سماج بیان کے کھلے اور ڈھکے چھپے دونوں طریقے سے ان ناولوں میں موجود ہے۔ طریق کار کے پرانے فریم ورک ٹوٹ چکے ہیں اور ناول نگار پیچیدہ کیفیات پیش کرنے کے لئے الفاظ اور زبان کے سراب آمیز میدانوں سے گزر رہے ہیں۔ ان کے بیانیہ میں واقعے کی صرف اوپری سطح اہم نہیں، واقعے کے اندرون میں برپا تلاطم، کرداروں کی زندگی اور کارکردگی میں ہلچل اور کشمکش اور ان پر گزرتی ہوئی لمحاتی اور دوررس کسک چھپی ہوئی ہے جس کے محاسبے اور واقعیت کے بغیر نئی تنقید ان کی روح تک نہیں پہنچ سکتی۔

اس صدی میں اردو ناول کی سمت و رفتار آگے چل کر کیا ہوگی یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا، مگر ایک بات ہمیں مطمئن کرتی ہے کہ بہار میں اکیسویں صدی کا یہ پندرہ سالہ عرصہ ناول کی تخلیق کے لحاظ سے بھرپور رہا ہے۔ ہم کسی لحاظ سے تہی دامنی کی شکایت نہیں کر سکتے۔ اس کے باوجود میرا یہ احساس اپنی جگہ پر رہتا ہے کہ نئی صدی کے ناولوں میں موضوعات کا تنوع تو پیدا ہوا ہے، مگر اردو ناول کو آفاقیت سے ہمکنار کرنے کے لیے یا عالمی ادب کا ہم پلہ قرار دینے کے لیے ناول کے اسالیب اور افکار میں جن تجربات اور عمومی تنوع کی ضرورت ہے، شاید ابھی اردو ناول ان سے دور ہے۔ ❀❀

افسانہ ''گرہن'' کا تنقیدی جائزہ (ص ۱۷ سے آگے)

دیو مالائی اساطیر اور مابعد الطبیعاتی عناصر کے استعمال سے اپنی کہانیوں کو پراسرار اور ادھیاتمک فضا میں تبدیل کرنے کا عمل اسی ''گرہن'' سے شروع ہوا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس میں نقش اول کی کچھ خامیاں بھی موجود ہیں۔ ہولی ساہوکار کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے۔ وہ کوئی نادار نہیں ہے۔ اس کے میکے والے ہیں۔ ''ایک چادر میلی سی'' کی رانی کی صورت حال بھی یہاں نہیں ہے۔ وہ جننی ہے وہ دیوی کا جلالی روپ بھی دھارن کر سکتی ہے، لیکن یہ سب کچھ یہاں نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے عقل و شعور سے کام لیتی ہے۔ جب کہ بیدی کے آزادیٔ وطن کے بعد کے افسانوں میں مذکورہ عناصر کا استعمال اپنے فنی کمال اور تخلیقی عروج پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ بیدی کا یہی امتیازی وصف انہیں اپنے معاصرین سے ممیز و ممتاز کرتا ہے اور انہیں انفرادی پہچان عطا کرتا ہے جس پر نہ پریم چند کی چھاپ ہے، نہ چیخوف کی، نہ گوگول کی، اگر ان پر کسی افسانہ نگار کی مہر ثبت ہے تو وہ صرف اور صرف راجندر سنگھ بیدی کی ہے جو عالمی افسانے میں اپنی مثال آپ ہے۔ ❀❀

ڈاکٹر قیام نیر

HOD of Urdu, N.J. Mahila. College, Dist: Madhubani (Bihar)

زبان وبیان کا جادوگر: کرشن چندر

کرشن چندر کے افسانوں میں زبان کی تازگی، شگفتگی، شیرینی اور شعریت ہر جگہ موجود ہے اور اس نے ان کے اسلوب کو ایسی لطافت عطا کر دی ہے جو ڈھونڈنے سے کسی دوسرے فنکار کے یہاں نہیں ملتی:

’’اس کے نازک ہاتھ، مرمریں انگلیوں کی پور میں جنگلی گلاب کی کلیوں کی طرح حسین، اس کی چال جیسے دوشیزہ بہار اپنی تمام لطافتوں اور رعنائیوں کو لیے ہوئے ہوا کے دوش پر اٹھلاتی ہوئی آ گئی ہو۔ اس کی آواز صنوبر کے جنگلوں میں گھومتے ہوئے گڈریئے کی بانسری کی طرح میٹھی اور ابلتے ہوئے چشموں کے ترنم کی طرح لوچ دار......‘‘ (ویکسی نیٹر)

کرشن چندر قصہ بیان کرنے میں اپنا ایک الگ انداز رکھتے ہیں۔ اسی الگ انداز نے انہیں ایک انفرادیت عطا کی ہے اور دوسرے افسانہ نگاروں پر سبقت دلائی ہے۔ لفظوں کے استعمال میں ان کے یہاں جو جدت طرازی ملتی ہے وہ دوسرے لوگوں کے یہاں نہیں ملتی۔ ایک ہی لفظ کو مختلف زاویہ نظر اور مختلف انداز سے پیش کرنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ انداز بیان کو دلکش بنانے کے لیے انہوں نے تشبیہیں، اشارے، کنائے، حسین ترکیبیں یہاں تک کہ طنز و مزاح کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا اسلوب دلکش اور رواں دواں ہے۔ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ حسین جملے تراشنے کی وجہ سے ان کے افسانے جھلملاتے اونچے ستاروں کی مانند ہو گئے ہیں۔ بقول وارث علوی:

’’کہنے والوں نے کرشن چندر کو اردو افسانہ کا سب سے بڑا شاعر غلط نہیں کہا۔ اردو نثر پر بے پناہ عبور، اردو زبان کا خلاقانہ استعمال، ایک پر کیف اور سحر آفریں اسلوب کی کرشمہ سازیاں، یہ وہ صفات ہیں جو کرشن چندر کے ہر قاری سے اپنا خراج وصول کرتی ہیں۔ ان کا اسلوب ان کی اچھی کہانیوں کا طاقتور عنصر ہے۔‘‘ (کرشن چندر کی افسانہ نگاری، وارث علوی، مشمولہ اردو افسانہ روایت اور مسائل، مرتبہ گوپی چند نارنگ، ص:۲۸۵)

کرشن چندر اپنے افسانوں میں تاثر کی وحدت پر زیادہ زور دیتے ہیں کوئی خیال ان کے ذہن میں ایک مکمل تاثر کی صورت میں ابھرتا ہے اور افسانے کے واقعات کا تانا بانا اور کردار دونوں اس تاثر کی دھند میں گھل مل جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے انہیں بنیادی طور پر تاثر کا مصور کہا جاتا ہے۔ ان کے اسلوب میں انشا پردازی کے ساتھ ساتھ شاعرانہ انداز ہے۔ ان کے یہاں ایک شاداب تخیل اور ایک ایسی طرز تحریر ہے جو پڑھنے والوں پر جادوئی اثر کر جاتی ہے۔ عزیز احمد کے مطابق:

’’جہاں تک طرز تحریر کا تعلق ہے اردو کا کوئی افسانہ نگار کرشن چندر کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ درد ہو یا طنز، رومانیت ہو یا حقیقت نگاری ان کا قلم ہر موقع پر ایسی دلکش چال چلتا ہے جو بانکی بھی ہوتی ہے اور انوکھی بھی، لیکن جو اس قدر سادہ اور فطری ہوتی ہے جیسے صبح کے وقت چڑیوں کی پرواز۔ تصنع کا بعید ترین شائبہ بھی کہیں نہیں پایا جاتا، جو نفس مضمون ہوتا ہے اس کی اندرونی موسیقی سے ہم آہنگ ہو کے ان کا قلم لکھتا ہے۔‘‘

(دیباچہ، پرانے خدا بحوالہ کرشن چندر، جیلانی بانو ص ۳۳)

کرشن چند کے اسلوب کی تعمیر میں زیادہ تر فطرت اور عورت کا حسن شامل ہے۔ دونوں کے حسن کے اظہار کے لیے انہوں نے موزوں الفاظ،

نئی نئی تشبیہیں، خوبصورت اور اچھوتی تراکیب اور شاندار فقرے کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ قاری اس سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے:

''دیہاتی عورت نے اپنی گود میں مچلتے ہوئے بچے کو دیکھا اور ہولے ہولے اپنے بٹن کھولنے لگی۔ ہولے ہولے وہ سپید دودھ بھری چھاتی بلاؤز سے یوں نکلی جیسے گہن سے چاند نمودار ہوتا ہے۔ بچہ خوشی سے ہمکنے لگا اور اپنے ننھے ہاتھ پھیلا کر غوں غاں کرتے ہوئے بیقرار ہونے لگا۔ دھیرے اور اطمینان سے بغیر کسی جھجھک کے اس دیہاتی عورت نے اپنی چھاتی کا منھ بچے کے میں منھ میں دے دیا اور بچہ ایک خوشی کی دبی ہوئی چیخ سے ماں کی چھاتی سے چمٹ گیا اور چپر چپر دودھ پینے لگا۔'' (کوکھ کی کونپل)

کرشن چندر کا طرز تحریر اردو افسانوی ادب میں ایک بڑی لطیف اور انوکھی سی چیز ہے، یہی وجہ ہے کہ کچھ نقادوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ بعض جگہ ان کا اسلوب شاعری کی حدوں کو پھلانگنے لگا ہے۔ وہ اپنے حسین اسلوب سے ایک ایسی جادوئی فضا اور مسحور کن زبان سے ایک ایسا دلکش اور دلنشیں ماحول تیار کر دیتے ہیں کہ قاری اس میں کھو کر رہ جاتا ہے:

''پہلے میں نے اس کی آنکھیں چومیں اور جھیل کی سطح پر لاکھوں کنول کھل گئے، پھر میں نے اس کے رخسار چومے اور نرم ہواؤں کے لطیف جھونکے یکا یک بلند ہو گئے، صدہا گیت گانے لگے، پھر میں نے اس کے ہونٹ چومے اور لاکھوں مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں میں دعاؤں کا شور بلند ہوا اور زمین کے پھول اور آسمان کے تارے اور ہواؤں میں اڑنے والے بادل سب مل کر ناچنے لگے۔''

(پورے چاند کی رات)

ظاہر ہے کہ فکر کے بغیر کوئی اسلوب ممکن نہیں۔ اسلوب کے لیے فکر کی بڑی اہمیت ہے۔ فکر و بیان کی انفرادیت جب تحریر کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیتی ہے تو اسلوب پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوب کے ذریعہ مصنف کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ موضوع اور مضمون کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، لیکن اظہار کے لیے مناسب زبان کا استعمال نہ کیا جائے تو فنی خوبیوں کے باوجود وہ ایک کامیاب تخلیق کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ کرشن چند کو زبان اور اسلوب بیان پر مکمل قدرت اور فکر میں بھی انفرادیت حاصل ہے۔ صفدر آہ نے کتنا درست فرمایا ہے:

''کرشن چندر کا اسٹائل تو اردو کا وہ اعجاز ہے جو کرشن چندر سے پہلے کسی افسانہ نگار میں دیکھا گیا اور نہ اس کے بعد آج تک نظر آیا۔'' (ڈاکٹر صفدر آہ، ماہنامہ ''ادب نکھار'' مئو اگست ۱۹۷۷ء، کرشن چند نمبر ص ۳۶)

کرشن چندر کے افسانوں میں زور بیان، لطافت بیان اور تشبیہات کے بہت سے نمونے ملتے ہیں جو نہ صرف دلوں کو چھو جاتے ہیں بلکہ اس کی روشنی قاری کے دل و دماغ پر دیر تک جھلملاتی رہتی ہے۔

کرشن چندر نے دوسرے بہت سے موضوعات کے ساتھ ساتھ ادیب و شاعر کی ناقدری اور معاشی کمزوری کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کا ایک پورا افسانوی مجموعہ ہی ہے جس کا نام ''کتاب کا کفن'' ہے۔ اس کے سارے افسانے ادیب کی ناقدری کو ظاہر کرتے ہیں:

''ایک ادیب کے لئے اپنے حسن تخلیق کا مناسب صلہ طلب کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اس لئے بھوکوں مرتا ہوں۔ کیوں اس دنیا میں مشین گن بنانے والے کو لاکھوں دئے جاتے ہیں اور ایک خوبصورت افسانہ لکھنے والوں کو بھوکا مارا جاتا ہے؟ کیوں ایک معمولی سنترے کا رس نچوڑنے والا آلہ ایجاد کرنے والے کو ہزاروں روپئے دئے جاتے ہیں اور زندگی کا رس گھولنے والے شعر کے لیے ایک روپیہ مانگنا تجارت سمجھا جاتا ہے۔'' (جوگی)

ان کے مشہور افسانہ ''ان داتا'' کا ذکر کرنا یہاں ضروری سمجھتا ہوں۔ اس میں ان کے اسلوب کے کئی عناصر موجود ہیں۔ حالانکہ یہ افسانہ قحط بنگال پر لکھا گیا ایک حزنیہ افسانہ ہے، لیکن اس میں لطافت بیان اور تشبیہات کو اس طرح پیش کرنا ان ہی کے بس کی بات ہے:

''ہائے وہ جل پری کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ سمندر میں طلائی مچھلی کی طرح تیرنے والی سبک اندام بنگالی دوشیزہ،

وہ پھول کا سا حسن جس میں تاج کا مرمر، ایلورا کے
مندروں کی رعنائی اور اشوک کے کتبوں کی ابدیت
کھدی ہوئی تھی، آج کدھر غائب ہوگیا تھا، کس لیے یہ
حسن، یہ ممتا، یہ روح اس سڑک پر ایک روندی ہوئی
لاش کی طرح پڑی تھی۔'' (ان داتا)

۱۹۴۷ء کے فسادات سے متاثر ہوکر لکھا گیا ان کا افسانہ ''پشاور اکسپریس'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں مہاجرین کے تبادلے میں مردوں اورعورتوں کو اپنے اپنے علاقے میں ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ عورتوں کی عزت وناموس کو تارتار کیا گیا۔ ان حشر سامان گھڑیوں میں ان عورتوں پر کیا گزری اس وحشت ناک منظر میں بھی کرشن چندر نے لطافت بیان، زور بیان اور تشبیہات کو اس طرح سمودیا ہے کہ اس کی تاثیر دو آتشہ ہوگئی ہے:

''وہیں اس طرح کھلے میدان میں جہاں گیہوں کے
کھلیان لگائے جاتے تھے اور سرسوں کے پھول مسکراتے
تھے اور عفت مآب بیبیاں اپنے خاوندوں کی نگاہ شوق کی
تاب نہ لاکر کمزور شاخوں کی طرح جھکی جھکی جاتی تھیں۔
اس وسیع میدان میں جہاں پنجاب کے دل نے ہیر رانجھے
اور سوہنی مہیوال کی لافانی الفت کے ترانے گائے تھے،
انہی شیشم، سرس اور پیپل کے درختوں تلے وقتی چکلے آباد
ہوئے۔ پچاس عورتیں اور پانچ سو خاوند۔ پچاس بھیڑیں
اور پانچ سو قصاب، پچاس سوہنیاں اور پانچ سو مہیوال۔
شاید اب چناب میں کبھی طغیانی نہ آئے، شاید اب کوئی
وارث شاہ کی ہیر نہ گائے۔'' (پشاور اکسپریس)

تقسیم ملک کے بعد پھوٹ پڑنے والے فسادات کو موضوع بنا کر کرشن چندر نے کئی اچھے افسانے لکھے ہیں۔ ''ہم وحشی ہیں'' ان کا ایک ایسا افسانوی مجموعہ ہے جس میں چھ افسانے شامل ہیں اور سارے افسانے اسی موضوع پر لکھے گئے ہیں۔ اگر چہ یہاں کرشن چندر بدی کو آشکارا کرنا چاہتے اور نیکی کی قوتوں کو ابھرنے کا موقع دیتے ہیں، لیکن یہاں بھی ان کی زبان نے ایسا جادو جگایا ہے کہ بڑے بڑے فنکار سوچنے پر مجبور ہوجاتے ہیں:

''آج رگ وید کا ہر منتر خاموش تھا، آج گرنتھ صاحب کا
ہر دوہا شرمندہ تھا، آج گیتا کا ہر اشلوک زخمی تھا، کون
ہے جو میرے سامنے اجنتا کی مصوری کا نام لے سکتا ہے۔
اشوک کے کتبے سنا سکتا ہے۔ ایلورا کے صنم زادوں کے
گن گا سکتا ہے۔ بتول کے بے بس بھنچے ہوئے ہونٹوں،
اس کی بانہوں پر وحشی درندوں کے دانتوں کے نشان
اور اس کی بھری ہوئی ٹانگوں کی ناہمواری میں تمہاری
اجنتا کی موت ہے۔'' (ایک طوائف کا خط)

''ہم وحشی ہیں'' کے سارے افسانے اگر خون میں آلودہ نئے تقسیم شدہ ہندوستان کا نقشہ پیش کرتے ہیں تو ''اجنتا سے آگے'' ان کا ایسا مجموعہ ہے جس کے افسانے ہندوستانی سماج کے عزم اور ارادوں کی نئی منزل ہیں۔ اس مجموعے کے افسانہ ''میرا بچہ'' کا یہ اقتباس دیکھئے کہ اس میں بھی اسلوب کی دلکشی اور گہرائی ہے:

''بیٹا! تو انسان ہے، انسان اپنے ضمیر کا، اپنی تقدیر کا،
اپنی زمین کا خود خالق ہے، انسان قوم سے، ملک سے،
مذہب سے بڑا ہے۔ وہ اپنی روح تعمیر کررہا ہے تو ہم سے
نیا ہے۔ اپنی جدت سے اس روح کو نئی سربلندی عطا کر۔
تیرے اور میرے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ نہیں ہے۔
تیرے اور میرے درمیان صرف محبت کا رشتہ ہے جیسے
سمندر لہر سے، آگ شعلے سے اور ہوا جھونکے سے ملتی
ہے اسی طرح میں اور تو اس دنیا میں آکے مل گئے ہیں اور
ماضی سے حال اور حال سے مستقبل تعمیر کررہے ہیں۔''

کرشن چندر نے مختلف موضوعات پر افسانے لکھے ہیں۔ طبقاتی نظام کی پیچیدگی، جنسی بیداری، فطرت پرستی، نسوانی حسن، کشمیر کے نظارے، فرقہ وارانہ فسادات، مشینی زندگی سے پیدا شدہ مسائل، عورت کی زبوں حالی اور لمبے جہیز کے لین دین جیسے موضوعات کی ان کے یہاں فراوانی ہے، لیکن ان تمام موضوعات کو برتنے اور پیش کرنے کے لئے انہوں نے دلکش اسلوب حسین انداز اور نادر تشبیہات استعمال کی ہیں۔ اس خوبی کے لیے وہ ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔ ❁❁

افسانے

حسین الحق

Sir Syed Colony, New Karimganj, Road No. 6, Gaya 823001

ساعتوں کا چور

گرمی کی ایک تپتی جھلستی رات تھی۔

پرانے شہر کے مکانات کی ساخت بھی عجیب وغریب ہوا کرتی ہے، ایک مکان کی دیوار دوسرے مکان کی دیوار سے بالکل چسپاں، پہلے کے گھروں میں چہار دیواری کا تو کوئی تصور تھا ہی نہیں، حویلیاں بھی یوں بنتی تھیں کہ مکان کے چاروں طرف پہلے بلند دیوار کھڑی کردی جاتی اور ایک ہاتھی یا طویل القامت گھوڑا گزرنے کے لائق بلند دروازہ بنایا جاتا جس سے امیروں اورنوابوں کے ہاتھی گھوڑے یا پالکیاں اندر داخل ہوتیں اور بلند دروازہ بند ہوجاتا۔ یہ دروازہ عام آدمیوں کے لئے نہیں کھلتا تھا۔ عام آدمی کے لئے اسی دروازے میں ایک بغلی یا تختی دروازہ ہوتا جس سے عام آدمی ذرا جھک کر آیا جایا کرتا تھا۔ یہ چہار دیواری اتنی بلند ہوا کرتی تھی کہ اردگرد کی آواز، بو، یا ہوا اس کے اندر داخل نہیں ہوپاتی، بس آسمانی ہوااور روشنی اس کے اندر داخل ہوجایا کرتی تھی۔ ان حویلیوں کے علاوہ کچھ حویلی نما مکانات بھی ہوا کرتے تھے جن میں ان حویلیوں سے قدرے کم رقبے میں بنے مکانات، ان حویلیوں سے کم بلند چہاردیواری میں گھرے نظر آتے۔ دونوں طرح کی عمارتوں میں دیواروں سے لگے لگے کہیں اصطبل، کہیں ہاتھی خانہ، کہیں گوشالہ، کہیں نوکروں کے مکانات یا گھروں میں بچوں کی تعلیم کے لئے مولوی اوراس کے اہل خانہ کے لئے ایک چھوٹا سا رہائشی حصہ بھی رہتا۔

ان کے علاوہ جو مکانات ہوا کرتے تھے ان کی دیواریں ایک دوسرے سے بالکل چسپاں ہوا کرتی تھیں، کروس و نٹلیشن تو دور کی چیز ہے، مکان میں شعاع دان بھی نہیں ہوا کرتے تھے۔ کہاں سے ہوتے، ہر مکان کی دیوار تو پڑوسی کی دیوار سے لگی کھڑی تھی، شعاع دان کیسے نکلتا؟ اور گر کہیں گنجائش میسر آگئی اور صاحب مکان کی ''شہری حس'' بھی کچھ زیادہ بیدار رہی، تب بھی شعاع دان یوں بنائے جاتے کہ ان کا رخ کسی باغ، بانس واڑی، یا سامنے سے گزرتے راستے کی طرف نہ ہوکر سیدھے آسمان کی طرف ہوتا تا کہ آسمانی روشنی، ہوا تو گھر میں داخل ہوجائے مگر زمین کا کوئی شخص یا گھر کی کوئی عورت اور لڑکی زمانے کی طرف نہ دیکھ پائے۔

یہ مکانات زیادہ تر گراؤنڈ فلور تک محدود رہتے، بعض گھروں پر اب چھت بھی پڑنے لگی تھی، ورنہ زیادہ تر کھپریل ہی کے ہوا کرتے تھے، مگر آنگن ہر گھر کے لئے لازمی تھا، اس آنگن میں مرغی کا ڈربہ، بجبجاتی نالیاں، برتن دھونے کی جگہ، وہیں پر مسالہ پیسنے کے لئے سل بٹہ وغیرہ عمومی طور پر نظر آتا۔ جوان جوڑے گرمی، برسات، جاڑا ہر موسم بغیر شعاع دان کے کمروں میں ہی گزار دیا کرتے۔ بچے، غیر شادی شدہ جوان اور بوڑھے چھتوں پر سوتے، عورتیں عموماً دالان میں اور شدید گرمی پڑنے پر آنگن میں پلنگ ڈال لیتیں، مگر اذان سے پہلے اٹھ جاتیں۔

ایسے ہی مکانات میں سے کسی ایک مکان کی چھت پر گرمی کی ایک تپتی جھلستی رات میں کہانی کا مرکزی کردار خواب دیکھ رہا تھا کہ چونک پڑا۔ کچھ شوروغل کی آواز سنائی دی، فوری طور پر تو وہ کچھ نہیں سمجھ پایا کہ کیا ہو رہا ہے۔ چاند کی آخری تاریخ تھیں، اس لئے کچھ دکھائی تو نہیں دے رہا تھا، مگر آوازیں بار بار فضا کا سینہ چیرتی اس تک پہنچتی محسوس ہو رہی تھیں۔

چند ثانیہ بعد جب وہ نیند سے پوری طرح بیدار ہوا تو اسے احساس ہوا کہ اپنی چھت پر یا اس کے اردوگرد کی چھتوں پر کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی، مگر آوازیں بہر حال آرہی تھیں۔ اندازہ ہوا کہ محلے کے اردگرد کا ہی کچھ معاملہ ہے۔ اس نے آس پاس سوئے بزرگوں کو دیکھا، اندھیرے میں کیا نظر آتا، بس کچھ ہیولے چت لیٹے نظر آئے، باپ،

چچا، بڑے بھائی سبھی بستروں پر لیٹے تھے اور پٹ پٹ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''پھر چلا۔'' باپ، چچا میں سے کوئی بولا۔

''یہ کدھر چل رہا ہے؟''

بڑے بھائی نے بالکل سرگوشیوں میں سوال کیا۔

''اس اندھیرے میں کیا پتہ چلے گا؟''

باپ نے رائے ظاہر کی۔ اس نے لیٹے لیٹے ہی محسوس کیا کہ آس پاس کی چھتوں پر بھی ہلچل جیسا کچھ ہے، رات کے سناٹے کا سینہ چیر کر پڑوسی کی سرگوشیاں بھی اس چھت تک پہونچ رہی تھیں اور گلی میں سپاہی کے لاٹھی پٹخنے کی آواز آرہی تھی۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

اس نے سوچا۔ اسے یاد آیا کہ ادھر کچھ دنوں سے کچھ ہو رہا ہے، کچھ ایسا جسے رُواں رُواں محسوس کرے، مگر جسے بیان نہ کیا جا سکے۔ اسے لگا وہ سہم گیا ہے، اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ اٹھ کر صورت حال کو سمجھنا چاہتا تھا، مگر جب بڑے نہیں اُٹھ رہے تھے، سب کے سب لیٹے ہوئے ہی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے تو وہ کیسے اٹھتا۔

اندھیری رات سر پر کھڑی رہی۔ سب اپنی اپنی چھتوں پر اپنے اپنے بستروں پر لیٹے رہے۔ بس جب نہ تب کبھی ادھر سے، کبھی اُدھر سے سرگوشی ابھرتی رہی:

''......پھر چلا......پھر چلا......پھر چلا......''

اسے نیند کب آئی؟ صبح میں اس نے سوچا تو اسے یاد نہ آسکا۔ اس کا گھر مولویوں کا گھر تھا، ٹیلی ویژن ممنوع تھا، باپ چچا ریڈیو سنتے دکھائی دیئے۔ گھر کی فضا میں امس تھی، کچھ حبس کا احساس، ناشتے کے وقت بھی بڑے غیر معمولی طور پر چپ تھے۔ وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ اس چپ کو توڑ سکے، گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا، محلے کے نکڑ پر ایک جملہ سنائی دیا:

''گویا وہ آ ہی گیا۔''

''کون آ گیا؟''

اس نے اپنی عمر سے ذرا کچھ بڑے لڑکے سے پوچھا۔

''اب ایسے بھی بھولے مت بنو جیسے تم کچھ جانتے نہیں۔''

وہ لڑکا آہستہ سے بولا اور آگے بڑھ گیا۔

اس کے پاس خموش رہنے کے علاوہ کوئی سبیل نہیں تھی۔

اس نے محسوس کیا کہ بڑی عمر والا لڑکا کچھ زیادہ غلط نہیں کہہ رہا ہے، کیوں کہ اس کے آنے نہ آنے پر یا اس کے ہونے نہ ہونے پر کئی دنوں پہلے جب ایک جگہ بحث چل رہی تھی تو وہ بھی موجود تھا اور بڑی عمر والا لڑکا بھی۔

اس نے یاد کرنا چاہا کہ اس دن کیا بحث چل رہی تھی؟ اسے یاد آیا کہ تذکرہ چھڑا ہوا تھا، کسی نے کہا تھا کہ وہ اگر آ گیا تو بہار کی رُت چلی جائے گی، سیلاب آئیں گے، ہواؤں میں زہر گھل جائے گا، کھیت بنجر ہو جائیں گے، زلزلے آئیں گے، لوگوں پر معاش تنگ ہو جائے گی اور آہستہ آہستہ جو آج ہے اس میں سے کچھ بھی نہ رہے گا۔

مگر اس دن بھی سمجھ نہ آسکا تھا کہ وہ...... آنے والا وہ کون ہے؟ وہ ادبدا کر دوستوں کی طرف بھاگا، مگر آج تو دوستوں کا رنگ بھی نرالا تھا۔ اکثر دوستوں نے اپنے چھوٹے بھائیوں سے کہلوا دیا کہ

''بھیا گھر پر نہیں ہیں''

ایک دو دوستوں سے ملاقات ہوئی تو ان کا رونا بھی وہی تھا۔

''سب کہہ رہے ہیں کہ وہ آ گیا، مگر وہ ہے کون؟''

اس بھاگ دوڑ میں آدھا دن بیت گیا اور تھک ہار کر وہ گھر کی طرف مڑ گیا۔ راہ چلتے اس نے محسوس کیا کہ لوگ چل رہے ہیں، مگر یوں جیسے لاشے حرکت میں ہوں۔ سب چپ، اردگرد سے بے نیاز، آنکھیں بے نور اور منکے ڈھلے ہوئے۔ دو کانیں یوں تو کھلی ہوئی تھیں، مگر ان میں گاہک نہیں تھے۔ کچھ لوگ باتیں کرتے اور مسکراتے بھی نظر آئے، مگر ان کی مسکراہٹوں پر اداسی کا رنگ غالب تھا۔ اس نے سوچا، اس کے آنے یا اس کے ہونے کا معنی صرف یہی ہے؟ لشٹم پشٹم دن گزر گیا اور رات پھر آ گئی...... پھر وہی جلتی سلگتی رات، وہی اندھیرے میں چھتوں پر چت لیٹے ہوئے ہیولے، وہ حسب سابق خواب کی وادیوں کا مسافر تھا۔ وادی میں دو بے الشتئے نظر آئے۔ عجیب و غریب تھی ان کی ہیت کذائی۔ اس نے غور کیا، پورے وجود پر آنکھوں کے سوا کچھ نہ تھا، اس نے غور کرنا چاہا کہ یہ لڑکے ہیں یا لڑکیاں، سر منگول بچوں جیسا، آنکھ کینچوؤں کی طرح اور سرخ ناک کا صرف ایک دہانہ نظر آرہا تھا، ہونٹ کا پتہ نہیں تھا بلکہ منہ بھی شاید نہیں تھا، مگر پتہ نہیں اس وقت اسے کوہ قاف کیوں یاد آیا تھا۔ وہ مسکرا رہے تھے یا مسکرا رہی تھیں۔ اس نے غور کیا وہ کہیں جا رہے تھے یا

جارہی تھیں اور چلتے چلتے انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔اس دیکھنے میں استہزا تھا اور بے نیازی بھی۔اس کو یاد آیا کہ خواب ہی میں اس نے غور کرنا چاہا تھا کہ وہ اور یہ دونوں، ٹرانس جنڈر کے نمونے کس جگہ ہیں؟ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس نے صحرا کی گرم ریتیلی ہواؤں کا احساس کیا تھا، شاید کہیں بہت دور انجیر اور کھجور کے درخت تھے اور ڈینیوب کی لہروں میں کوئی حلقہ نہیں تھا۔گنگا ترل ترل بہہ رہی تھی یا راوی اور چناب کا پانی ہلکورے لے رہا تھا اور وہ ان سے ذرا فاصلے پر تھا۔اس نے ان کی طرف بڑھنا چاہا تھا، وہ بڑھ رہا تھا۔وہ دونوں جہاں تھے یا جہاں تھیں وہیں کھڑے تھے یا کھڑی تھیں۔وہ ان دونوں کی طرف بڑھتا رہا۔وہ دونوں کھڑے رہے یا کھڑی رہیں اور فاصلہ ایک بالشت بھی کم نہیں ہوا۔اسی موہوم تحریک کے درمیان اسے بم چلنے کی آواز سنائی دی۔وہ چونک پڑا۔

وہ چونک کر جاگا تو دیکھا کہ وہ اپنی چھت پر تھا اور چھت پر کھلبلی مچی ہوئی تھی، ابا، تایا، بھائی سب جاگ گئے تھے۔کوئی اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، کوئی کھڑا تھا، کوئی چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور اندھیری رات تنبو تانے کھڑی تھی اور چھت پر پٹاپٹ ڈھیلے گر رہے تھے۔

''چلو چلو نیچے چلو، کم بختوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔''

ابا گھبرائے گھبرائے سے کھڑے ہوگئے اور سیڑھی کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ ہبڑ دھبڑ سبھی نیچے کی طرف بھاگے۔چاروں طرف چیخ و پکار جاری تھی، شور و غل کے درمیان بھدی بھدی گالیاں چھتوں چھت ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک آرہی تھیں اور جارہی تھیں۔

ساری رات اسی خلفشار کی نذر ہوگئی، مگر سب گھروں میں قید رہے کہ شرفا اندھیری راتوں میں گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔

''اس کے آنے کے بعد یہ سب تو ہونا ہی ہے۔''

انتہائی حبس زدہ اور پر اسرار ماحول میں تایا کا جملہ گونجا۔

دوستوں کی منڈلی جمی تو پتہ چلا کہ یہ کسی ایک محلے کا مسئلہ نہیں تھا، ہر محلے میں کچھ نہ کچھ انہونی ہو رہی تھی۔

''ہمارے محلے میں تو طشتری چلتی ہے۔''

عبدالجلیل بتانے لگا۔

''طشتری چلتی ہے؟ کیا مطلب؟''

اس نے حیرت سے عبدالجلیل کی طرف تکا۔

''کیوں تم طشتری کے بارے میں نہیں جانتے؟''

''نہیں تو!''

''لو بھلا!'' عبدالجلیل ہنسا:''تمہارا محلّہ تو تکیہ داروں کا محلّہ ہے، سب کہتے ہیں کسی تکیے ہی سے چلی ہوگی۔''

''ابے یہ ہے کیا؟''

''یہ کچھ یوں ہے بچُو! کہ طشتری پر کسی گھر کا پتہ اور کچھ نقش لکھ کر، پھر اسے پھونک کر، ہوا میں اڑا دیا جاتا ہے اور وہ طشتری ہوا میں اڑتے ہوئے اس گھر تک پہونچ جاتی ہے، جس کا اس پر پتہ لکھا ہوا ہے۔اگر صرف ڈرانا ہے تو کسی آدمی کا نام نہیں لکھا جاتا پس وہ طشتری اس گھر کے اندرونی طول و عرض میں چکراتی پھرتی ہے، اگر کوئی پکڑنا چاہے تو پارے کی طرح ہاتھوں کے درمیان سے پھسل جاتی ہے اور اگر کسی کو مارنا ہے تو طشتری پر اس کا نام بھی لکھ دیا جاتا ہے تب وہ طشتری سیدھے اس آدمی کی گردن سے ٹکراتی ہے اور تلوار کا کام کرتی ہے۔

''خدا کی پناہ!'' وہ اس کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔

''ابھی بیچ کے صوبے میں یہی تو ہو رہا ہے۔''

عبدالعزیز اچانک بول پڑا۔

''تم بھی یار کہاں کی بات کہاں لے جا کے پٹختے ہو؟''

راہل چور سیا بولا۔

''کہیں کی اینٹ، کہیں کا روڑا؛ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔''

وقار اسجد صغوی نے قہقہہ لگایا۔ بیچارہ، عبدالعزیز چپ کا بیٹھا سب کا منھ دیکھا کیا اور غپ شپ جاری رہی۔

''ارے وہاں تو طشتری نظر بھی آئی۔'' شمس الدین بتانے لگے۔''مرکزی علاقے میں تو ایک موہوم سا نقطہ وہی کام کر رہا ہے۔''

''موہوم سا نقطہ؟ بھئی یہ تو اور حیرت ناک بات ہے، ذرا تفصیل سے بتاؤ۔'' سبھی نے چونک کر شمس الدین کی طرف توجہ کی۔

''ہاں وہاں کے بارے میں والد صاحب کے ایک دوست والد صاحب کو بتا رہے تھے تو میں نے سنا۔''

''بتاؤ بھی کیا سنا؟''

ایک ڈاکٹر کی کلینک اس کے گھر کے بغل میں ہے۔ اس نے اپنی کلینک میں سی سی ٹی وی کیمرہ لگایا تو اس کا کنکشن اپنے گھر میں بھی دے دیا۔ ڈاکٹر کے ہاتھ میں قدرت نے شفا دی ہے، اس لئے وہ کافی مشغول رہتا ہے اور چوں کہ بغل کے گھر میں ڈاکٹر کے باپ ماں اور بال بچے رہتے ہیں، اس لئے وہ دل جمعی کے ساتھ اپنا وقت ہسپتال میں گزارتا ہے۔ اس دن بھی وہ ہسپتال میں کافی دیر تک رہا تھا اور لگاتار مشغول و پریشان بھی رہا تھا۔ ہوا کیا کہ ایک ایسا مریض ہسپتال میں داخل ہوا جو سب کے لئے جان کا جنجال بن گیا۔ یہ مریض پچھلے ایک ہفتے سے نرسنگ ہوم میں داخل تھا، جب مریض داخل ہوا تھا تو پیٹ میں درد کی شکایت کر رہا تھا، مگر مشکل یہ تھی کہ درد کسی ایک جگہ نہیں تھا، کبھی پیٹ کے بیچوں بیچ محسوس ہوتا، کبھی دائیں کبھی بائیں، ایکسرے، الٹراساؤنڈ، کسی میں کوئی وجہ نظر نہیں آرہی تھی، جب انڈواسکوپی کی گئی تو پیٹ کے پچھلے حصے میں ایک نقطہ سا دکھائی دیا، مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ نقطہ کس چیز کی علامت ہے۔

ڈاکٹر، جونیر ڈاکٹر، نرسنگ ہوم میں موجود مختلف امراض کے ماہرین سب سر جوڑ کر بیٹھے، مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ تھک ہار کر شہر کے کچھ قابل ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا۔ آخر میں فیصلہ یہی ہوا کہ پیٹ کا آپریشن کیا جائے اور اگر کوئی فاسد مادہ ہے تو اس کو نکال دیا جائے، مگر چوں کہ یہ ایک پیچیدہ آپریشن تھا، اس لئے دارالسلطنت کے علاوہ باقی جگہوں پر جو جان پہچان کے ماہرین تھے ان کی خدمات لینے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔ کئی ماہرین سے ڈاکٹر کی گفتگو ہوئی وہ لوگ آنے کو تیار بھی ہو گئے، مگر سب کی اپنی اپنی مصروفیتیں اور مشغولیتیں تھیں، لہٰذا ایک تاریخ پر سب کی موجودگی کو ممکن بنانے کے لئے آٹھ دن کا انتظار کرنا پڑا۔

اس بیچ مریض کی کیفیت نے بھی تابڑتوڑ پہلو بدلا۔ پہلے پیٹ میں جہاں تہاں درد ہوتا تھا۔ کچھ دنوں بعد، پیٹ میں کسی کے چھوئے بغیر گدگدی ہونے لگی، پھر مریض تقریر کرنے لگا۔ ایسی دھواں دھار تقریر جس پر حیرت ہو کہ ایک نہایت خموش رہنے والا آدمی اتنا کیسے بولنے لگا اور تقریر بھی کسی ایک موضوع پر نہیں، کبھی مذہب، کبھی سیاست، کبھی تاریخ، کبھی تہذیب اور پھر کبھی بھدی بھدی گالیاں، پھر ایک دو دن ایسے بھی آئے کہ اس کو اپنی جان کا ڈر ستانے لگا، ہر آنے جانے والے کو پکڑ کر کہتا:

''وہ مجھے مروا دیں گے۔''

جب پوچھا جاتا کہ کون؟ تو جواب میں کبھی کہتا ''شیر''، کبھی کہتا ''بھائی''، کبھی کہتا ''لاڈلا'' عجیب بے ربط باتیں جن کا اور نہ چھور، جن کا مطلب نکالنا دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہوتا۔ پھر ایک دن قئے کرنے لگا، سکوں کی قئے......زوردار قئے اور ہر ابکائی گندگی میں لتھڑے ڈھیر سارے سکے باہر لاتی۔ اسپتال کا عملہ اور وہاں موجود سارے لوگ سکے بٹورنے کے لئے آپا دھاپی کرنے لگے، پورے ہسپتال میں افراتفری مچ گئی۔ مریض قئے کر رہا تھا اور سب لوگ اس گندگی میں ہاتھ ڈال ڈال کر سکے تلاش کر رہے تھے جو سکہ پالیتا وہ مسکرانے لگتا، جسے نہ ملتا وہ دوبارہ اسی گندگی میں لتھڑ جاتا۔

اسی بیچ ماہرین آگئے اور جلد از جلد آپریشن کا فیصلہ لے لیا گیا۔ اوٹی میں آپریشن ٹیبل پر جب مریض کا پیٹ چیرا گیا تو مریض ہنس رہا تھا اور ڈاکٹر حیران پریشان تھے کہ اس کو آخر درد کیوں نہیں ہو رہا ہے، مگر اس مسئلے پر بہت دیر تک غور کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا، کیوں کہ دوسری حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ چیرے ہوئے پیٹ سے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔

اور پھر یوں ہوا کہ جب ڈاکٹر نے پیٹ کھولا تو پیٹ کے طول و عرض میں ایک بہت بڑے غار کا سامنا کرنا پڑا، جس میں اندر تو مکمل اندھیرا تھا ہی، غضب کی بات یہ کہ باہر کی روشنی کی کوئی شعاع اندر نہیں جا پا رہی تھی، مگر اندر دیکھنا تو ضروری تھا۔ ٹارچ کا انتظام کیا گیا، پانچ بیٹریوں والا ٹارچ آیا، مگر اس کی روشنی بھی ناکافی ہوئی پھر ایسے کئی ٹارچ فراہم کئے گئے نتیجہ صفر رہا۔ تنگ آکر ایک ڈاکٹر نے اندر ہاتھ ڈال دیا، جس وقت اس ڈاکٹر نے پیٹ کے اندر ہاتھ ڈالا، اسی وقت مریض کا بہت زوردار اور ہولناک قہقہہ بلند ہوا۔ وہ زور زور سے بہت دھواں دھار انداز میں پھر تقریر کرنے لگا، زبان کئی زبانوں کا ملغوبہ محسوس ہو رہی تھی، کبھی کچھ گجراتی الفاظ سنائی دیتے، پھر لہجہ مراٹھی ہو جاتا، کچھ

راجستھانی کی بھی آمیزش محسوس ہوئی، ہریانوی اور کھڑی بولی بھی تقریر کا حصہ تھی۔ ڈاکٹر صاحبان تھوڑی دیر تو متحیر اور دم بخود رہ گئے، مگر پھر اس عالم سے لوٹے تو اس ڈاکٹر کی طرف دھیان گیا جس نے اپنا ہاتھ پیٹ کے اندر ڈالا تھا۔ اس ڈاکٹر کا کہیں پتہ نہ تھا مگر اس کی آواز آرہی تھی:

''بچائیے......کچھ کیجئے......''

سب نے غور کیا تو احساس ہوا کہ آواز تو پیٹ کے اندر سے آرہی ہے، مگر پیٹ کے اندر اتنا گہرا اندھیرا تھا کہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا، پھر بھی آواز پر دھیان دیا گیا تو صاف سنائی دیا۔

''بچائیے......مدد کیجئے...... میں نے پوری بانہہ اندر ڈالی تھی، مکمل خلا تھا، میں کچھ اور سمجھنے اور محسوس کرنے کے لئے کاندھوں کے بل جھکا اور اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا، پیٹ کے اندر گر گیا۔ گرنے کے بعد قدم رکھنے کے لئے کوئی سطح نہ مل سکی۔ میں اب تک کہیں پر ٹھہر نہیں پایا ہوں مسلسل اندر گرتا جارہا ہوں، مگر اب ایک نئی بات ہوئی ہے، اب یہاں روشنی ہے، لیکن یہ روشنی چاند یا سورج کی نہیں ہے، یہ بجلی سے پیدا ہونے والی روشنی بھی نہیں ہے، کچھ فاسفورس کا کرشمہ محسوس ہورہا ہے، روشنی کے بھبھکے سے اٹھتے ہیں اور ناپید ہوجاتے ہیں، فضا میں کافور کی بو محسوس ہورہی ہے یا جیسے خون کے تھکے کا تھکا ارد گرد ہو، مگر میں مسلسل نیچے کی طرف گرتا جارہا ہوں، میں کہاں جاؤں گا، میں کیا کروں گا ......پلیز بچائیے......آپ لوگ کچھ کیجئے......''

آپریشن تھیٹر میں افراتفری سی مچ گئی، وارڈ بوائے پہلے بھاگا، پھر نچلی سطح کا عملہ بھی چپکے سے باہر کھسک گیا۔ کمپاؤنڈر کچھ ٹھہرا پھر وہ بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ ایسے میں ڈریسر کہاں سے تھمتا۔ اوٹی میں بچ گئے تھے صرف ڈاکٹر صاحبان جن میں سے ایک اندر جاچکا تھا۔ نرسنگ ہوم کے مالک ڈاکٹر کا حال خراب تھا۔ ایک بوڑھے ڈاکٹر کا بلڈ پریشر بڑھ گیا اور وہ چکرا کر زمین پر گر گیا۔ باقی ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے، مریض اٹھ تو نہیں پا رہا تھا، مگر اس کے قہقہے مسلسل جاری تھے۔ اسی بیچ نوجوان ڈاکٹر نے ہمت کی اور کہا:

''سر! ڈاکٹر صاحب اندر اکیلے ہیں اور مسلسل فریاد کر رہے ہیں، مجھ سے اب برداشت نہیں ہورہا ہے، میں بھی اندر جارہا ہوں۔''

اتنا کہہ کر وہ بھی پیٹ کے اندر زور سے یہ کہتا ہوا کود گیا کہ:

''ڈاکٹر گھبرانا مت، میں بھی آرہا ہوں۔''

اب اندر کی صورت حال یہ تھی کہ دونوں ڈاکٹر آگے پیچھے اندر اندر گرتے چلے جارہے تھے اور پہلا ڈاکٹر رواں تبصرہ کرتا جارہا تھا:

''سنو ڈاکٹر! روشنیوں کے جھماکے ہو رہے ہیں، میں دیکھ رہا ہوں، یہاں چاروں طرف کھنڈرات ہیں۔ کہیں دور دور تک ریگستان پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں، ایک طرف آگ لگی ہوئی ہے جو ہر چیز کو جھلسا رہی ہے، مگر اس میں تپش نہیں ہے۔ کچھ دور پر برف کے پہاڑ ہیں، میں ان برفیلے پہاڑوں کے قریب پہنچ گیا ہوں، مگر ان میں ٹھنڈک نہیں ہے...... چاروں طرف ایک اتھاہ سناٹا اور تنہائی، آدم نہ آدم زاد......مگر نہیں نہیں...... کچھ دور پر ایک ہیولا نظر آرہا ہے......میں اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں......ہاں میں اس کے قریب پہونچ گیا ہوں...... ارے یہ تو ایک نومولود مخلوق محسوس ہورہی ہے، عجیب وغریب......اس کے دونوں پیر دونوں کندھوں پر ہیں، دونوں ہاتھ مقعد کے دونوں طرف لٹکے ہوئے ہیں......آنکھ ناف کے نیچے، ناک مقعد کے اوپر اور کان مقعد کے سوراخ کے دونوں طرف لٹکے ہوئے ہیں، مقعد ہی منھ کا کام کر رہا ہے، مقعد سے غلاظت نکل رہی ہے اور وہ مقعد ہی میں موجود، دانت سے اسے چبا رہا ہے، وہ دیکھنے میں نومولود لگ رہا ہے مگر اچھلتا کودتا بھاگتا جارہا ہے......ہاں ڈاکٹر ملہوترا بھی مجھے مل گئے ہیں، میں اور وہ دونوں اب خلانوردوں کی طرف تیرتے ہوئے پتہ نہیں کدھر جارہے ہیں......آپ لوگ خدا کے لئے کچھ کیجئے ہمارا کیا ہوگا۔ ہم یہ کہاں پھنس گئے ہیں۔''

باہر ان کی آواز بہت نزدیک سے آتی محسوس ہورہی تھی، مگر وہ دونوں کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اتنے میں ڈاکٹروں کی مزید کمک آگئی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ مریض کے گھر والوں کو اس کا حال بتایا جائے، اس کے رشتہ دار اندر بلائے گئے، ان لوگوں نے مریض کا جو حال دیکھا تو حواس باختہ ہوگئے۔

عام آدمی کے نزدیک ایسے معاملات اسطوری ہوجاتے ہیں۔ گھر والوں کے نزدیک بھی مریض اب راکشس کی جون میں تبدیل

ہو چکا تھا۔ ماں، باپ، بیوی، بھائی سب نے بیک زبان کہا:

''اس کا جو کرنا ہے، کیجئے، ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔''

ڈاکٹروں نے بیوی اور باپ سے اجازت نامہ لکھوا کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اور مریض کا پیٹ پوری طرح سے چیر دیا گیا۔ صرف پیٹھ سے لگا چمڑا باقی رہ گیا۔ مریض مر چکا تھا، دونوں ڈاکٹروں کا اندر باہر کہیں پتہ نہ تھا۔ سب حیرت اور غم میں تھے کہ یہ کیا ہوا اور کیسے ہوا؟

ابھی یہ حیرت ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اچانک باہر بہت زور کا ہنگامہ ہوتا سنائی دیا۔ دریافت حال کے لئے ایک دو آدمی باہر گئے اور اندر آ کر یہ وحشت ناک خبر سنائی کہ نا موجود ڈاکٹر جس عجیب الخلقت اور عجیب الهیئت مخلوق کے بارے میں بتا رہا تھا وہ تو ہسپتال کے باہر دکھائی دیا، پھر وہاں سے اچھلتا کودتا شہر کی طرف چل پڑا۔ سڑکوں پر اور بازاروں میں افراتفری مچ گئی ہے، وہ پچھلی تمام عمارتوں کو ڈھا رہا ہے، خلق خدا تراہ تراہ کر رہی ہے، مگر وہ سب سے بے خبر اور شاید اپنے سے بھی بے خبر مقعد کی غلاظت مقعد سے کھا رہا ہے اور مقعد سے سونگھ رہا ہے اور ناک کے نیچے سے دیکھ رہا ہے۔

پھر اس خبر پر کچھ مدت گزر گئی

اور آخری خبر یہ ملی کہ جسے اس کے اپنوں نے راکشس جانا تھا اسے دیش کے لوگوں نے دیوتا سمجھ لیا اور اپنا راجہ بنا لیا۔

اصل میں پھاٹک کھلا تو سب سے آگے یہی نظر آیا تھا۔ یہ داستان کس ملک کی ہے۔ مرکزی کردار اس بارے میں گومگو کا شکار ہے۔

کہانی کا اگلا قدم یہ ہے کہ ڈاکٹر جب کلینک سے حیران پریشان گھر آیا تو سبھی لوگ سو چکے تھے۔ بیوی نے انتظار کر کے کھانا ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کے ڈھک دیا تھا۔

ڈاکٹر یہ سوچ کر کمرے میں داخل ہوا کہ ملحق غسل خانے میں ذرا منھ ہاتھ دھولے تو کھائے، مگر اس کا موقع کہاں ملا؟ وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، فضا میں تیرتا ایک منحنی سا نقطہ ڈاکٹر کی گردن سے ٹکرایا اور ڈاکٹر کی گردن اس کے جسم سے الگ ہو کر ایک کنارے پھینکا گئی۔

ڈاکٹر کے گرنے کی آواز سے بیوی کی نیند ٹوٹ گئی، منظر دیکھ کر وہ چیختی ہوئی اور سینہ پیٹتی ہوئی کمرے کے باہر بھاگی۔ اس کی آواز سن کر ڈاکٹر کے ماں باپ اور دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے کمروں سے باہر نکلے۔ بیوی نے روتے چیختے ہوئے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ سب کمرے میں داخل ہوئے اور دم بخود رہ گئے۔

ڈاکٹر کی موت کے بعد جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا، اس سلسلے کی آخری دو خاص باتیں یہ ہیں کہ موت کے دوسرے دن جب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سامنے آئی تو اس میں پوسٹ مارٹم کی روایتی یافت (فائنڈنگ) کے بجائے ایک تصویر تھی جس میں ایک انگلی ڈاکٹر کی گردن ریتتی نظر آئی۔

دوسری قابل ذکر بات یہ کہ ڈاکٹر کے چھوٹے بھائی نے سی سی ٹی وی کیمرے سے موت کے دن کی تصویریں دیکھنی شروع کیں تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے گھر میں داخل ہونے کے وقت سے پانچ منٹ پہلے ایک موہوم سا نقطہ صدر دروازے کے پاس پہنچا۔ اس وقت گھر کے دونوں کتوں نے شور مچانا شروع کیا۔ گھر کے سب لوگوں کو بھی یاد آیا کہ نو ساڑھے نو کے درمیان کتے آسمان کی طرف منھ اٹھا کر زور زور سے بھونکنے لگے تھے۔ گھر کے لوگوں نے کتوں کو ڈانٹا بھی تھا، پچکارا بھی تھا، پھر تنگ آ کر دونوں کو ان کے رہنے کی جگہ پر لے جا کر باندھ دیا گیا تھا، مگر اس کے بعد بھی وہ بھونکتے رہ گئے تھے۔

بہر حال! وہ موہوم نقطہ صدر دروازے سے داخل ہوا اور اس کا سیدھا رخ تیر کی طرح ڈاکٹر کے کمرے کی طرف تھا، مگر ایر کنڈیشنڈ کمروں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے دروازے عموماً بند رہتے ہیں اور کھولنے پر کھلتے ہیں، لہٰذا نقطہ دروازے تک جاتا تھا اور ٹکرا کر واپس آجاتا تھا، پھر جاتا تھا اور پھر ٹکرا کر واپس آجاتا تھا۔ اسی جانے اور آنے کے درمیان کسی وقت گھر کا کوئی فرد کمرے میں داخل ہوا اور سی سی ٹی وی میں صاف نظر آیا کہ اسی وقت وہ نقطہ بھی اندر داخل ہو گیا، مگر اندر داخل ہو کر بھی وہ اس وقت تک کمرے کے طول و عرض میں چکر کاٹتا رہا جب تک خود ڈاکٹر کمرے میں داخل نہیں ہوا اور شوہر کے قتل کے بعد جیسے ہی بیوی روتی چیختی باہر نکلی، نقطہ بھی باہر نکل گیا اور گھر کی فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اس کے بعد سی سی ٹی وی کیمرہ بالکل سفید تھا۔

جس نے بھی سنا اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ''خدا کی

پناہ! یہ واقعہ ہے کہ خواب ہے کہ خیال ہے کہ مفروضہ ہے؟'' کئی طرف سے سوال اٹھا۔ ''لیکن بیوی تو کمرے میں تھی، اس کا قتل کیوں نہیں ہوا؟'' سوال پر سوال ہو رہا تھا۔

یہ واقعہ ہے اور سچا واقعہ ہے اور بیوی کو اس لئے کچھ نہیں ہوا کیوں کہ وہ نقطہ اصلی شئے نہیں تھا بلکہ عمل کا سیمیائی اثر تھا اور اس عمل میں عامل نے ڈاکٹر کا ہیولا بنا کر اس کے چاروں طرف کچھ لکھ کر اس کا نام بھی لکھا ہوگا اور اس ہیولے پر اور نام پر سوئیاں چبھوئی ہوں گی۔

''مگر یہ تکئے کا عمل معلوم نہیں ہوتا، یہ سب سفلی عمل میں ہوتا ہے اور عموماً اوگھڑ اسے شمشان میں مہا کال کے دن مردے کی کھوپڑی میں شراب پی کر کرتے ہیں۔'' کسی سننے والے نے رائے ظاہر کی۔

''اب جس نے بھی کیا ہو، مگر ایسی باتیں اس کے آنے کے بعد کثرت سے شروع ہوگئی ہیں۔''

''ہاں! ایسا عمل جس میں آپ اصل مجرم کی گرفت نہ کر سکیں۔''

''اور جس کی تاویل میں دشواری پیش آئے۔''

''یعنی آپ جو کہیں دوسرا اس کو اپنی دلیل سے غلط ثابت کر دے۔''

''اور ان سب کا نتیجہ ہمیشہ کمزور کے خلاف ہو جاتا ہو۔''

تس پر ایک دوست ہنسا:

''نتیجہ کمزور کے حق میں آیا کب ہے؟''

''ہاں سو تو ہے۔'' زیادہ تر دوست تھک ہار کر، اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکے اور محفل برخاست ہوگئی۔

کہانی کا مرکزی کردار جب گھر کی طرف چلا تو رات آہستہ آہستہ اپنے پر پھیلانے لگی تھی۔

گرمی کی رات بہت کھلی کھلی رہتی ہے، چاند دکھائی دیتا ہے، ہوا خوش گوار محسوس ہوتی ہے، اگر گرم ہوا ہے تو ناگواری کا احساس بھی واضح رہتا ہے۔ دوکانیں دیر تک کھلی رہتی ہیں، لوگ آتے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ رات گرنے پر آئے تب بھی سڑکیں سناٹی نہیں ہوتیں، کتے خوب خرمستی کرتے ہیں، بلیاں جی بھر کے راستہ کاٹتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وجود پر پالا گرتا محسوس نہیں ہوتا ہے۔

مگر آج تو عجیب حال تھا۔ چاند کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا، ہوا محسوس نہیں ہو رہی تھی، دوکانیں بند تھیں، اکا دکا لوگ جلدی جلدی کسی طرف جاتے بلکہ بھاگتے دکھائی دیئے، کسی مکان دوکان کے اوٹے پر کوئی بندہ سویا نظر نہیں آ رہا تھا۔ کتے خموش تھے، بلیاں ناپید تھیں اور وجود کے اندر ایک عجیب قسم کی ہولناک معدومیت سر اٹھاتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ گھر پہونچا تو سبھی منتظر تھے۔ اسے دیکھ کر سب نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے باپ نے تنبیہ کی۔ ''اتنی دیر تک باہر نہیں رہنا چاہئے، سورج ڈوبتے ڈوبتے گھر آجایا کرو۔''

اس نے سنا اور خموش رہا، کیا کہتا اور کیسے کہتا۔ گھر نے جیسے چپ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ باپ، تایا، بھائی، بہن، ماں، چچی، بھابھی کسی کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ کھانے کے بعد جب وہ چھت کی طرف چلا تو باپ نے آہستہ سے کہا:

''نیچے ہی سو رہو۔''

''کیوں؟''

اس کیوں کا کسی نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ تھک ہار کر، کچھ دیر بعد، آنگن میں پڑی ایک چارپائی پر وہ لیٹ گیا۔ آج سب بڑے مرد بھی آنگن میں تھے، دادی، ماں، چچی اور چھوٹے بچے دالان میں چلے گئے تھے۔ رات گرتی گئی، مگر گھر پر اور محلے میں ایک مسلسل اور پراسرار سی خموشی طاری رہی، اسے اندازہ ہوا کہ آس پڑوس کی چھتوں پر بھی آج کوئی نہیں ہے۔ اس نے اپنے اردگرد ایک شدید قسم کی تنہائی، اداسی اور بھیدوں بھری غیر محفوظیت، بہت شدت سے محسوس کی۔

لیٹے لیٹے بہت دیر گزر گئی۔ اسے حیرت ہوئی، آج نہ نیند آ رہی تھی، نہ خواب آ رہے تھے۔ اردگرد باپ، بڑا بھائی سب لیٹے تھے، چپ تھے اور کروٹیں بدل رہے تھے۔ اسے لگا کوئی بھی سویا نہیں ہے یا سو نہیں پا رہا ہے۔ اسی عالم میں رات کا کافی عرصہ گزر گیا، ساڑھے بارہ سے ایک کے بیچ کا عمل رہا ہوگا کہ اچانک آنگن میں ''بھد'' کی آواز آئی۔

محسوس ہوا کہ کچھ گرا، مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا گرا؟

کپڑے کی گٹھری؟ مٹی کا لوندا؟ یا کھانے کی کوئی بڑی سی پوٹلی؟ ابھی وہ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ پھر، ''بھد بھد'' کچھ گرنے کی

آواز آئی۔ باپ، تایا، بھائی سبھی اٹھ کے بیٹھ گئے۔ ان کے بیٹھتے بیٹھتے گرنے کی رفتار تیز ہوگئی۔ تقریباً سبھی کی چارپائی پر کچھ نہ کچھ گر رہا تھا اور پورے ماحول میں بدبو کے شدید بھبھکے اٹھ رہے تھے۔ بڑے بھائی نے جلدی سے اٹھ کر آنگن کا بلب روشن کیا تو کراہت اور خوف سے طبیعت میں گویا سنسنی سی پھیل گئی۔ اندر سے ابکائی کا زور ہوا اور رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ آنگن میں چاروں طرف پیخانہ، کیچڑ اور گاڑھا گاڑھا قئے جیسا کچھ مادہ بکھرا پڑا تھا۔

مانو گھر میں ایک ہڑکمپ سا مچ گیا۔ عورتیں چیخنے لگیں، بچے رونے لگے، بھائی غصے میں چیخ چیخ کر کسی انجانے کو برا بھلا کہنے لگا، باپ اور تایا بالکل دم بخود تھے۔ شاید صورت حال کو سمجھنا چاہ رہے تھے اور سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ صورت حال گندگی اور سنگ دلی کی اس انتہا تک پہنچ جائے گی۔

اس بیچ کو تو قریباً سب نے مان لیا تھا کہ وہ آچکا ہے، مگر اس کے آنے کا مطلب سنگ باری اور گندگی کا اچھال ہوگا، یہ کہیں کسی کے تصور میں بھی نہیں تھا۔ اب جب وہ دیش کا راجہ ہو چکا تھا تو سبھی نے بھلائی اسی میں جانی کے خموشی سے اس کو برداشت کیا جائے تاوقتیکہ فیصل شہر پر کوئی دوسرا شیر نہ آپہنچے، مگر یہ تو حد ہوگئی۔

گھر کے لوگ ابھی حیص بیص ہی میں مبتلا تھے کہ گھر کے باہر بھی چیخ وپکار ہونے لگی۔ اندازہ ہوا کہ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے ہیں۔ اب گھر میں بند رہنا کسی کو صحیح نہیں لگا، سب گھر سے باہر آگئے۔

محلے کے زیادہ تر لوگ میدان میں جمع تھے۔ اکبر بھائی، شعیب چچا، اظہار دادا، کامل ماموں، عید محمد انصاری، اسمٰعیل خاں، ابصار ملک وغیرہ وغیرہ، مگر پاس کے محلے میں سناٹا براج رہا تھا۔

سب میدان میں جمع تھے۔ گندگی سبھوں پر چاروں طرف سے برس رہی تھی۔ کل تک تو باپ کو اور دوسرے لوگوں کو بھی پورا شک تھا کہ محلے ہی کے کچھ شریر لڑکے لوگوں کو پریشان کرنے کے لئے کہیں سے چھپ کر ڈھیلا چلا رہے ہیں، مگر آج تو اسٹریٹ بلب کی روشنی میں صاف نظر آرہا تھا کہ اس قسم کے سارے منچلے لڑکے، پنکو، شمشیر، لڈن خاں، گڈو یہیں پر تھے اور اس کے بعد بھی گندگی لگاتار حملہ آور ہو رہی تھی، مگر پاس کے محلے میں سناٹا براج رہا تھا۔

اچانک پنکو، شمشیر خاں، لڈن اور گڈو آگے بڑھے۔

''کدھر جارہے ہو؟''

لڈن کے چچا نے زور سے پوچھا۔

''ذرا پوچھا تو جائے، وہ لوگ اطمینان سے کیوں سو رہے ہیں؟''

''اب نیا لفڑا مت کھڑا کرو، خموشی سے یہیں کھڑے رہو۔''

ایک بزرگ نے ڈانٹا۔

''چچا ہم لوگ بھی موقع محل سمجھتے ہیں۔ ہم نرم سے بات کریں گے۔'' شمشیر خاں نے اطمینان دلایا اور سامنے کے محلے کی طرف بڑھ گیا۔ چاروں میں سے ایک نے اس محلے کے انتہائی شریف آدمی کے گھر پر دستک دی، اس نے دروازہ کھولا تو گڈو نے بہت آہستگی اور احترام سے پوچھا:

''چاچا ہم لوگوں نے کیول حال چال پوچھنے کے لئے آپ کو کشٹ دیا۔ ہماری چھتوں پر کہیں سے کچھ پھینکا جارہا ہے۔ آپ لوگوں کی طرف سب کشل منگل ہے نا۔''

''ہاں بچو! اِدھر تو کچھ نہیں ہے۔ ہم تو گہری نیند میں تھے۔''

''آپ آرام کیجئے چچا۔ بیچ رات جگانے کے لئے ہم چھما چاہتے ہیں۔''

چاروں نے واپس آکر رپورٹ دی تو حیرت دوبالا ہوگئی، مگر کیا کیا جاسکتا تھا؟ بس اتنا پتہ چل گیا کہ ادھر سکھ شانتی رہے گی اور اِدھر پتھراؤ اور گندگی کا سامنا کرنا ہوگا۔ دیر رات تک یہی سلسلہ رہا، گھنٹوں بعد گندگی کی بارش رکی تو لوگ گھروں کی طرف مڑے، اندازہ ہوا کہ اب تو فجر کی اذاں کا وقت قریب ہی ہے۔

دوسرے دن جب دوستوں کی منڈلی پھر جمی تو پتہ چلا کہ یہ بھی کسی ایک محلے کا معاملہ نہیں تھا، ایک طرف کے تمام محلے بے چین رہے اور دوسری طرف سب لوگ بے فکر ہو کر سہانے خواب دیکھتے رہے۔

طبیعت بہت اچاٹ ہو رہی تھی اور دل بے چین تھا۔ اس بے چینی کو کچھ کم کرنے کی خاطر سب دوست گھومنے کے لئے نکل گئے اور

گھومتے گھومتے شہر سے ذرا دور پر واقع چندتن پیر کی پہاڑی کے دامن کی طرف چل پڑے۔ اس کو پہاڑی کہا جاتا تھا، مگر یہ ایک بلند و بالا پہاڑ تھا جو ہر موسم میں جوانوں کا مرکز نظر بنا رہتا۔ برسات میں اس کی چوٹی سے دامن تک ہریالی اور متعدد جھرنوں کا سماں دل لبھاتا۔ جاڑے میں پہاڑ کی خاموشی الگ داستان سناتی ...... گزرے ہیں اس مقام سے کتنے کارواں ...... اور گرمی میں دامن کوہ میں، سالوں بھر تھوڑا بہت جاری رہنے والے ایک دو جھرنے گھومنے والوں کے لئے تھوڑی سی ٹھنڈک مہیا کر دیتے۔

سب جب روانہ ہوئے تو شام ہو چلی تھی۔ ہوا کچھ نرم ہونے لگی تھی۔ بازاروں کی رونق بھی لوٹ رہی تھی۔ راستے میں اور دو کانوں پر زعفران کا چھڑکاؤ محسوس ہوا۔ ہر طرف سواستیکا نظر آ رہا تھا، سبھی کو کشمیر اور جرمنی کا مزا آ گیا، پھر ایسا بھی لگا جیسے چاروں طرف سرسوں پھولی ہوئی ہے، خلق خدا سودے سلف کے لئے گھروں سے باہر تو نکل گئی تھی، مگر ایک طرف والے کافی چوکنا تھے اور جدھر سرسوں پھولی تھی ادھر بسنت رت تھی۔

وہ جب پہاڑ کے پاس پہنچے تو پہاڑ اپنی تمازت، بلندی اور عظمت نمائی کے ساتھ موجود تھا۔ ان سے پہلے کچھ اور منچلے بھی پہنچے تھے اور وہ ایک جھرنے کی ٹھنڈک سے لطف اندوز ہو رہے تھے، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ وہاں پر کچھ حضرات گائڈ کے انداز میں لوگوں کی رہنمائی کر رہے تھے اور بتا رہے تھے:

''یہ ہزاروں ہزار برس پہلے کے راجہ گرو ایشور ناتھ کا محل ہے اور یہ جو سیڑھیاں آپ دیکھ رہے ہیں، انہیں سیڑھیوں سے اس محل تک جایا جاتا ہے۔ ہزار برس پہلے کی پانڈولپی جو ناگ پور کے شکھچا سنچالک کے پاس سے پراپت ہوئی، اس میں اس محل کا پورا وِورن ملتا ہے۔ محل میں ۱۰۵ کمرے ہیں، جن پر ویدک یگ کی اتی سندر ہست کلا کا پرمانٹر ملتا ہے...... اس محل کا پچھمی دوار...... اور پوربی دوار...... اور راجہ رانی کا وشرام گرہ......''

وہ اور جانے کیا کیا بولتا رہا۔

سب دوستوں نے بھاگ لینے میں ہی پناہ جانی۔

''یہ ایک نیا لفڑا شروع ہوا ہے۔''

کچھ دور نکل آنے کے بعد ایک دوست بولا:

''جو ہے اس کو 'نہیں' قرار دے دو اور جو نہیں ہے اس کو 'ہے' بنا دو۔''

سب خموش رہے، شاید کسی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ سب کو لگا کہ دم گھٹ جائے گا۔ مرکزی کردار کو یاد آیا، باپ نے سورج ڈوبنے سے پہلے گھر آنے کی ہدایت کی تھی۔

اس کے قدم بے ساختہ تیز ہو گئے، وہ تیزی سے گھر کی طرف بھاگ رہا تھا کہ وہ اس کی آخری پناہ گاہ تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیا باقی ہے؟ رات تو سر پر کھڑی ہے، مگر کیا یہ قصہ رات کی رات ختم ہو جانے والا ہے؟ یا یہ رات پھیل کر پورے زمان پر چھا جائے گی؟

ایک مرتبہ پھر اسے اپنا وہ خواب یاد آیا جس میں دو بالشتیے یا کم قد کے افراد نظر آئے تھے جن کی آنکھوں میں استہزا تھا اور بے نیازی بھی اور یاد آیا کہ اسی خواب میں اس نے صحرا کی گرم ریتیلی ہواؤں کو محسوس کیا تھا، شاید کہیں دور انجیر اور کھجور کے درخت بھی تھے، کوہِ قاف کی پریاں بھی تھیں، آمیزن کے خطرناک جنگل بھی تھے، ڈینیوب کی لہروں میں کوئی حلقہ نہیں تھا، راوی اور چناب کا پانی بس ہلکورے لے رہا تھا، البتہ شیونا کی لہریں مضطرب تھیں اور بحر ہند اپنے جوار پر تھا۔ ادھر امیتابھ بچن بہت بوجھل اور قدرے تحکمانہ انداز میں گا رہا تھا۔

...... دھیرے بہو گنگا جی، دھیرے بہو جمنا جی! چاروں طرف بہار یہ کا اعلان تھا، مگر پیلی آندھی زور پکڑ رہی تھی۔ مرکزی کردار نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اضطراب آمیز اداسی کے ساتھ سوچا:

''ہر رات کے بعد دن کو تو بہر حال آنا ہی ہے، مگر دن کو تو ہر رنگ کی ضرورت ہے، صبح کاذب ہو، چمکیلی دھوپ ہو، سرمئی شام ہو، شفق ہو، قوسِ قزح ہو اور سرخ آفتاب بھی ہو۔''

خیال کی رو کے یہاں تک پہنچتے پہنچتے اس پر یہ بھید کھلا کہ دن کے سب رنگوں میں پیلی آندھی کی حیثیت صرف گھس پیٹھئے کی ہے۔

❀❀❀

ڈاکٹر کوثر جمال

29-Governors Way, Macquarie Links, Sydney NSW-2565 Australia

ساتواں منطقہ

ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہیں میرے پاس تھی۔ شام اولین رات کے گلے میں بانہیں ڈالے کب سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ بڑھتے اندھیرے نے مجھے کچھ یاد دلایا۔

''روشنی کردوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں کردو!'' اس نے کہا۔ میں نے اٹھ کر شمع جلائی۔

''روشنی کچھ بڑھا دو۔'' میں نے دوسری شمع جلائی۔

''سب شمعیں جلادو، سارے بلب، سب فانوس۔''

اس نے ایک بار پھر کہا۔

اب ہم آمنے سامنے کے صوفوں پر تیز روشنی کی پھوار تلے بیٹھے ہیں۔ میں اس کی نگاہوں کے حصار میں قید ہوں۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''فاصلہ!''

''کیا ہمارے بیچ فاصلہ آگیا؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''وہ تو ہمیشہ سے ہے۔ اس وقت بھی تھا جب ہم ایک تھے اور ایک نہیں تھے اور اب بھی ہے جب ہم ایک نہیں ہیں اور ایک ہیں۔''

''تم ہمیشہ کی طرح اب بھی مکالمہ بول رہی ہو۔''

''کیا مکالموں میں سچ نہیں ہوتا؟''

''کیا فاصلہ ہی سچ ہے؟''

''ہاں! فاصلہ ہی سچ ہے۔ مہربان سچ۔ اس نے تو ہماری محبت کو بچالیا۔ یہ نہ ہوتا تو ہماری محبت ایک بندھن کی قید میں گل سڑ جاتی (یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں کے تالاب بھر گئے) فاصلہ نہ ہوتا تو جانے آج ہم ایک دوسرے کے لئے کیا ہوتے۔ شاید ہمیں ایک دوسرے سے وہ ان گنت شکایتیں ہوتیں جو شوہروں کو بیویوں اور بیویوں کو شوہروں سے ہوجاتی ہیں۔ میں تمہاری ہوجاتی تو شاید تم میرے ہو کر بھی میرے نہ رہتے۔ میں تمہارے گھر میں ہر وقت نظر آنے والی، حواس کی گرفت میں آجانے والی، ہر دوسری عورت جیسی ایک عام سی عورت ہو کے رہ جاتی۔''

''اور اب؟'' میں پوچھتا ہوں۔

''اب میں تمہارے حواس کے ساتویں منطقے میں رہتی ہوں۔''

(بس اپنی انہی باتوں میں وہ میری ہر عورت سے الگ ہے)

''کیا ہم رشتوں ناتوں کی اس جیتی جاگتی دنیا میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے؟''

''شاید نہیں''

''آخر کیوں نہیں؟'' میں سوال کرتا ہوں۔

''اسی دنیا نے تو ہمارے لئے ساتواں منطقہ چنا، میں پانچویں عورت تھی اور مجھے پہلی بار چار عورتوں نے اپنی دنیا سے نکال باہر کیا۔''

''یہ پہلی چار عوتیں کون تھیں؟''

''ماں، بہن، بیوی، بیٹی، جیتی جاگتی دنیا پر راج کرتی عورتیں۔''

''اور تم؟''

''میں پریمیکا ہوں...... پانچویں عورت''

''اور میں کون ہوں؟''

''تم جانتے ہی ہو۔ بچوں جیسے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''پھر میں کسی فسوں میں گم اسی کے الفاظ دہرانے لگتا ہوں۔''

''میں پریمی ہوں، پانچواں مرد اور مجھے پہلے چار مردوں باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے نے اپنی دنیا سے نکال باہر کیا۔''

''وہ چاروں عورتیں میرے اندر تھیں۔'' اس نے کہا۔

''وہ چاروں مرد میرے اندر تھے۔'' میں نے کہا۔

اس کے لبوں پر تبسم ہے۔ میری آنکھوں میں مسکراہٹ۔ وہ مسکراتے ہوئے اتنی حسین کیوں ہو جاتی ہے؟ مجھے اس پر بے ساختہ پیار آ گیا ہے۔ میں اٹھ کر اسے بانہوں میں بھینچ لیتا ہوں، مگر یہ بھول گیا ہوں کہ وہ میرے حواس کے ساتویں منطقے میں رہتی ہے۔

اب تیز روشنی کی پھوار نے مجھے تھکا دیا ہے۔ میں اس سے پوچھتا ہوں:

''روشنی کم کرلوں''

''ہاں کرلو''

میں کچھ شمعیں بجھا کر اپنی پسندیدہ غزلوں کی سی ڈی لگاتا ہوں۔ مغنیہ نے شاعر کے لفظوں میں اپنا دل رکھ دیا ہے۔

''اے جذبہ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے''

ہم دونوں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے ہیں۔

''تم بھی تو کچھ باتیں کرو۔ جب سے آئی ہوں میں ہی بول رہی ہوں۔''

''میں چاہتا ہوں تم بولتی رہو۔ تمہاری باتوں سے جی کو قرار سا آ جاتا ہے۔''

''اب کیا بولوں؟''

''بس میرے ایک سوال کا جواب دے دو، سیدھا اور صحیح جواب۔''

''ہاں پوچھو!''

''کیا تمہیں مجھ سے کبھی محبت تھی؟''

''اف! تم ہر بار یہی سوال پوچھتے ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟''

''تم بات کو ہمیشہ کی طرح گھما رہی ہو۔ مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو۔''

''ہاں......تھی''

''کب؟ میں ایک بار پھر کسی بچے کی طرح تجرید کو مجسم ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ذرا یاد کرنے دو۔ ہاں، جب میری محبت نے تمہیں پہلا فون کیا تھا۔'' وہ مسکرائی۔

''اور......؟''

''جب میں تن تنہا تم سے ملنے تمہارے شہر چلی آئی تھی، اس رات پندرہویں کے چاند نے میرے ساتھ ساتھ سفر کیا تھا۔''

''اس رات بس دو ہی تھے جو جاگ رہے تھے، ایک میں ایک چاند۔''

''اور......؟''

''جب میں نے تمہیں پہلا خط لکھا تھا اور جواب میں تم نے ایک شعر لکھ بھیجا تھا۔

سکون دل کو ضروری ہے لمس کی لذت
کہانیوں میں کہیں زندگی نہیں ملتی

''......مرد ہو نا، اس کی گھن گھیریوں میں رہتے ہو۔''

(میرے دل میں ایک خاموش احتجاج اٹھا۔ تم عورتیں کتنی جھوٹی ہو۔ خواہش کی آندھیوں کو بغل میں چھپائے پھرتی ہو۔ اس کی پہلی آنچ پر پگھل کے بوند بوند ہو جاتی ہو، مگر پھر بھی......)

''کچھ کہا تم نے؟''

اس کی متبسم آنکھوں نے پوچھا اور مجھے ہمیشہ کی طرح یہ وہم ہوا کہ وہ میرے ذہن میں گھومتے خیال کو پکڑ کر مسکرائی ہے۔

''کیا اب بھی تمہیں مجھ سے محبت ہے؟''

میں گمان کے بھنور میں غوطے کھا رہا ہوں۔

''ہے کیوں نہیں، جتنی میں ہوں اتنی ہی وہ بھی ہے۔''

''کون؟''

''کیا تم بھول گئے کہ تم نے کیا پوچھا تھا؟''

اس کی نگاہوں میں شرارت اتر آئی۔

''تم مجھ سے اتنے سوال کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''تمہیں جان جو نہیں سکا۔ تم سراپا راز ہو۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ تم نے جان بوجھ کر خود کو پہیلی بنا لیا ہے۔ شاید یہی وہ میدان ہے جہاں عورت بازی لے جاتی ہے۔ عورت جب تک جسم ہے تو کتنی آسان ہے، ذہن بنتی ہے تو اتنی مشکل کیوں ہو جاتی ہے؟''

''عورت کوکون جان سکا ہے؟''اور وہ بھی پانچویں عورت''

یہ کہتے کہتے اس نے اپنی نگاہوں کا رخ مجھ سے ہٹا کر کمرے کی بیرونی دیوار کی طرف کرلیا جیسے دیوار سے پرے کچھ دیکھ رہی ہو۔

خاموشی دبے قدموں آئی اور ہمارے بیچ بیٹھ گئی۔ موسیقی تھم چکی تھی۔

''آج کی رات یہیں ٹھہر جاؤ۔ گھر میں میرے سوا اور کوئی نہیں ہے۔'' مجھے اس کے جانے کا دھڑکا سا لگا ہوا ہے۔

''کاش ایسا ہوسکتا، میرا چھوٹا بیٹا میری راہ دیکھتا ہوگا۔''

''کبھی کبھی تم مجھے صاحباں لگتی ہو، جس نے بھائیوں کو بچانے کی کوشش میں مرزا کو مروادیا تھا۔''

''میں نے تو تمہیں زندگی کی طرف بھیج دیا۔ تمہاری بیوی ہے، بچے ہیں، نوکری، رشتے ناطے ...... میں نے تو اپنی اور تمہاری محبت کو بچانے کے لئے......''

یہ کہتے کہتے آواز اس کے گلے میں گھٹ گئی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ عورت کی نم آنکھوں میں اتنا حسن کہاں سے آجاتا ہے۔ میرا بے اختیار جی چاہا کہ اس کے آنسوؤں کو ہونٹوں سے چن لوں اور میں بھول گیا کہ......

''اچھا چھوڑو اس ذکر کو'' وہ اشک آلود آنکھوں سے ہنس دی۔ تم بھی تو مجھے بتاؤ نا! وہ لمحے، وہ گھڑیاں جب تم نے مجھے چاہا تھا۔''

''اوہ، وہ لمحے......وہ بے انت، بے شمار لمحے......''

یادوں کی حرارت میرے خون میں دوڑنے لگی۔

''وہ شام جب جھیل کے کناروں پر جھکی گھاس میں اندھیرا چپکے چپکے اتر رہا تھا۔ جھیل کے پانی پر ڈوبتا سورج زعفران کی بارش کر چکا تھا، پھر اچانک تیز ہوا چلنے لگی تھی۔ یک دم اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ عناصر کتنے جوش میں تھے۔ بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، ہوا کا شور، بارش کا زور، جھیل کے پانی میں طغیانی اور ان سب سے زیادہ میرے اندر کا تلاطم، اس لمحے مجھے اپنی محبت کا احساس ہوا تھا۔ وہ تم تھیں، ہاں وہ تم تھیں، مجھے طوفان سے آشنا کرنے والی......''

''اور......؟''

''اور جب ہم بے سبب گاڑی میں گھومتے ہوئے ان دیکھے راستوں پر جانکلتے تھے۔ ہم چاہا کرتے تھے کہ راہیں انجانی ہوں اور چہرے ناشناسا سا۔ گلیاں، سڑکیں اور راستے کٹتے جاتے تھے، مگر سفر جاری رہتا تھا اور تم کہا کرتی تھیں:

''یہ اجنبی راہیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔ جانے اگلے موڑ پہ کیا ہوجائے۔ اس سڑک کی حد سے پرے کون سا اسرار گھات لگائے بیٹھا ہو۔ رومان تمہاری نس نس میں تھا اور اس سے تم مجھے بس اپنے جیسی لگا کرتیں، میری عورت''

''ہاں، پریم کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔'' پھر اس نے کچھ توقف کے بعد کہا:

''تمہیں ان دنوں کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ میرا خیال تھا مرد کی یادداشت ایسی باتوں کے لئے کمزور ہوتی ہے۔''

''وہ دن......

وہ سارے دن، مجھے تم سے زیادہ یاد ہیں۔''

میں نے کسی سرور میں ڈوبی آواز میں کہا۔

''مثلاً؟''

''مثلاً، وہ دن جب ہم انجلی کے گھر میں تھے اور وہ کہیں گئی ہوئی تھی، تب ہم نے کچن میں مل کر کھانا بنایا تھا اور جب میں چائے کی پہلے سے گندی پیالیاں دھو رہا تھا تو تم نے کہا تھا:

''مرد اگر عورت کا کام بانٹ لے تو پھر عورت کو کوئی کام بھی مشکل نہیں لگتا۔ جینا آسان اور بھلا لگنے لگتا ہے۔''

اور تم نے کہا تھا، وہ یاد سے یاد ملاتے ہوئے بولی:

''مردوں کو تو وہ عورتیں اچھی لگتی ہیں جو ان کے گھر کو جنت جیسا مکمل بنا دیں۔ اتنا مکمل کہ انگور کے دانے بھی خود بخود ٹوٹ کر ان کے منہ میں آگریں۔'' اور یہ سن کر تم نے بہت سی بے رنگ باتیں کرتے ہوئے کہا تھا:

''اسی لئے مردوں نے جنت اور حوریں بنائیں۔''

اس نے میری اس آخری بات پر چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی نگاہیں برہم تھیں۔

''یہ تم نے کیا کہا، بے رنگ باتیں، کون سی بے رنگ باتیں؟''

''کچھ نہیں، میرا مطلب ہے، پیار کی باتوں میں دوسری باتیں آجاتیں تو وہ بے رنگ ہی ہوتیں نا۔''میں نے وضاحت کی۔

''تم مردوں کا پیار زندگی سے الگ تھلگ، بس ایک شبستان، ہم عورتوں کا پیار تو زندگی جتنا بڑا ہوتا ہے۔''

''تمہیں generalize کرنے کا بہت شوق ہے، تم مجھے بھی ایسے مردوں میں......''میں نے شکایت کی تو وہ ایک بار پھر پریمیکا کے سندر روپ میں آگئی۔

''اور کون سی بات یاد ہے تمہیں؟'' اسے میرے ساتھ یادوں کے پھول چننے میں مزہ آرہا ہے۔

''وہ رات ...... میرے فلیٹ میں، ہم دونوں تھے۔ تم جانے پر بضد تھیں اور میں تمہیں کسی طرح جانے نہیں دے رہا تھا۔ میرا اصرار بڑھ رہا تھا۔ تمہاری گھبراہٹ اور غصے میں شدت آرہی تھی، پھر تم ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ چھڑوا کر کمرے سے باہر چلی گئی تھیں، تو اس لمحے مجھے مکمل تنہائی کا احساس ہوا تھا، اف تنہائی کا کیسا خوفناک احساس تھا۔''

''لیکن میں واپس بھی تو آگئی تھی۔''

''ہاں، کچھ دیر بعد جب تم واپس آئیں تو میں تمہاری طرف یوں لپکا تھا جیسے کسی ڈوبنے والے کے ہاتھ کشتی کا کنارا آجائے۔ تب مجھے موت سے گزر کر جینے کا تجربہ ہوا۔ مجھے اپنی مکمل نفی کے بعد پھر سے اثبات کی نوید ملی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مجھے اپنی زندگی میں تمہارے ناگزیر ہونے کا یقین ہو گیا تھا۔ تنہائی کا آسیب جب کمرے سے بھاگ گیا تو میں نے تم سے واپس آنے کی وجہ پوچھی تھی۔ تب تم نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا تھا:

''جب کوئی لڑکی اس طرح رات گئے روٹھ کر جاتی ہے تو پریمی اسے یوں اکیلے جانے نہیں دیتا۔ تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں آیا تھا۔''اور جب میں تمہیں چھوڑنے کے لئے چپل پہن کر گرم کمرے سے باہر نکل رہا تھا تو تم نے مجھے میری جیکٹ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اسے پہن لو، تمہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' (تم عورتیں شروع دن سے ماؤں جیسی ہوتی ہو)

خاموشی کے کئی پہر گزر گئے۔ لگتا ہے ہم نے یادوں کے سب پھول چن لئے ہیں۔ اب میں پھر وہیں آگیا ہوں جہاں سے چلا تھا۔

''تم میری دنیا سے کیوں نکل گئیں؟''میں نے اپنا سوال دہرایا۔

''بتا تو چکی ہوں۔''

''نہیں! میرا دل کہتا ہے تم نے ساری بات نہیں بتائی۔''

''سچ؟ تمہارا دل کہتا ہے؟''وہ شرارت سے مسکرائی۔

''کیوں؟ کیا میرے پاس دل نہیں ہے؟''

تمہارا دل تو میں لے چکی ہوں۔ وہ زور سے ہنسی، پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگی:''تو بتادوں؟''

''یہی تو پوچھ رہا ہوں۔''

اس بار اس کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''ایک روز ہم دونوں ساتھ ساتھ جا رہے تھے، کسی بڑی شاہراہ پر، اچانک مجھے محسوس ہوا کہ تمہاری رفتار میری رفتار سے مختلف تھی، پھر میں نے تمہاری آنکھوں میں جھانکا تو وہاں دو عورتوں کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ ایک میں تھی اور ایک وہ عورت جو مجھ سے تمہاری دنیا کی آخری عورت ہونے کا حق چھیننے والی تھی۔ میں نے آن کی آن میں تمہارے آئندہ زمانوں کو دیکھ لیا تھا، جہاں میں پوری نہیں آدھی تھی۔''

اس کی آنکھوں سے زخمی عورت کا غم و غصہ جھلکنے لگا۔ اس نے اپنی خود کلامی جیسی گفتگو جاری رکھی۔

''میری جبلت نے اسی وقت اچانک ایک فیصلہ کیا۔ نہیں یہ فیصلہ میرے اندر کی چار عورتوں میں سے ایک نے کیا تھا، مر کر جینے کا فیصلہ اور میں تم سے ہٹ کر شاہراہ سے نکلتی ایک گلی میں چلنے لگی...... تم نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور میرے پیچھے آنے لگے۔ میں نے قدم تیز کئے، تم نے تعاقب تیز کیا......اس روز سے میں چل رہی ہوں اور تم میرے تعاقب میں ہو...... دیکھو میں تمہیں کہاں لے آئی ہوں...... یہاں حواس کے اس ساتویں منطقے پر، یہاں اب صرف میرا راج ہے۔ صرف میرا۔''

اس نے کسی راجدھانی کی مغرور ملکہ کی طرح کہا۔ ہمارے آس پاس سناٹا شور مچا رہا ہے۔

''تو اس طرح تم نے مجھے چھوڑ کر تنہائیاں مجھے دے دیں۔'' میری آواز میں شکستگی تھی۔

''میں نے تمہیں تنہا نہیں کیا، تمہاری تنہائیوں کو آباد کر دیا۔''

اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

''تم تو سارے کریڈٹ اپنی جھولی میں بھر رہی ہو۔'' اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے مجھ سے محبت نہیں کی تھی۔ تمہیں تو اپنے آپ سے محبت تھی۔ اگر تم سوہنی ہوتیں تو چناب کے تلاطم سے ڈر نہ جاتیں۔

''اور تم...... تم کہاں کے رانجھے ہو؟''

اس نے خشمگیں نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

''تم بھی تو عورتوں کے ہجوم میں اپنی عورت کی پہچان نہ کر سکے۔ تمہیں یہی بتانے کے لئے مجھے تمہاری دنیا سے نکلنا پڑا۔''

''تو تم نے مجھے سزا دی؟''

''محبت میں کون کس کو سزا دیتا ہے؟ دونوں ہی گھائل ہوتے ہیں۔'' وہ ایک بار پھر میری بجائے کھوئی کھوئی نظروں سے دیواروں کے پار دیکھ رہی ہے۔ کئی زمانے گزر گئے۔

میں اس سے پوچھتا ہوں: ''کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا؟''

''میں ڈر کی دنیا سے بہت دور ہوں۔''

''پھر بھی؟''

''اگر میں تمہیں نہیں بھول پائی تو تم مجھے کیسے بھول سکتے ہو؟''

''یہ ضروری تو نہیں کہ تم نہ بھولو تو میں بھی تمہیں یاد رکھوں۔''

تم مجھے کبھی نہیں بھول پاؤ گے۔ یہ میں جانتی ہوں۔ یہ موت جتنا اٹل سچ ہے۔ مرد اس عورت کو کبھی نہیں بھول سکتا جس نے کبھی اس کی روح میں اجالا کیا ہو، جو اس کے ذہن کے ایوانوں میں اپنی آواز کی گونج چھوڑ آئے، جو اس کی ہو اور پھر کسی بے خبر لمحے میں اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کسی نامعلوم دنیا میں جا گرے۔''

''واہ! تم تو کہانیوں کی بات کر رہی ہو۔''

میں نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔

''ہم سب کسی نہ کسی بڑی کہانی کے کردار ہی تو ہیں۔''

اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

لمحے تیزی سے بھاگ رہے ہیں...... میرا دل میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔

''سچ کہوں؟ تم نے میری دنیا سے نکل کر مجھے غریب کر دیا۔''

''نہیں، میں نے ہماری دنیا سے نکل کر ہم دونوں کی محبت کو ہمیشگی دے دی۔ اب یہ تمہارے شعروں میں ڈھلے گی۔ میرے گیتوں میں لکھی جائے گی۔ اب یہ کہانی کی طرح امر ہے۔'' مدھم روشنی میں، میں اس کے چہرے کو جی بھر کے دیکھتا ہوں۔

''تم آج بھی اتنی ہی حسین ہو، جتنی تب تھیں۔ وقت تمہارے حسن کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔''

''تم مجھے پریمی کی آنکھ سے دیکھ رہے ہو نا، اس لئے، محبت کی آنکھ میں زمانے ٹھہر جاتے ہیں۔'' چپ کی تانوں پر لمحوں کا رقص جاری ہے۔

لمس کی خواہش نے میرے دماغ میں دھواں بھر دیا ہے۔

وہ میرے سامنے بیٹھی ہے اور بیچ میں صدیوں کی دوری ہے۔ روشنی بے جان ہے، وقت کی سانسیں رک رہی ہیں۔

شاید ہماری محبت میں کچھ کمی تھی، شاید ہمارے تصور، ہماری حقیقتوں سے الگ تھے۔ شاید ہم اپنے گمان کے جزیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ فون کی گھنٹی سکوت کو لہولہان کر گئی۔

یہ میری بیوی کا فون ہو گا۔ وہ گلہ کرے گی:

''آج آپ نے فون نہیں کیا۔ ہم ایک دو روز میں واپس آ جائیں گے، آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ ماسی نے کھانا بنا دیا تھا؟''

میں فون نہ کر سکنے کا کوئی بہانہ بناؤں گا۔ بیویوں سے اسی طرح کی جھوٹی سچی باتیں ہوا کرتی ہیں۔

میں فون سن کر واپس آیا تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔

مجھے بتائے بغیر وہ جا چکی تھی۔ وہ ہمیشہ سے اسی طرح وقت اور دیواروں کی حد سے آزاد سفر کرتی ہے۔ اپنی مرضی سے چپکے سے چلی جاتی ہے اور پھر اس طرح اچانک آ کر میری یاد کے ایوانوں میں دیے جلانے لگتی ہے۔

❁❁❁

یوسف عزیز زاہد
Moon Cottage, Al-Khair Street, Javeed Town, Lucky Dheory Road
Gulbahar No. 4, Peshawar, Pakistan

ایک گزرا ہوا کل

''ابھی تو پہلے سفر کی تھکن نہیں اتری تھی اور تم پھر......''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر کپڑوں کے ساتھ سوٹ کیس میں رکھ دیا۔

''تمہیں معلوم تو ہے ...... میرے لئے یہ سفر کتنا ضروری ہے؟ اور پھر سفر تو میری ساری تھکن نچوڑ لیتا ہے۔''

بال سنوارتے ہوئے میں نے آئینے میں اپنے خدوخال کو بڑھاپے کی مدھم لکیروں میں الجھتے دیکھا تو سفر کی طلب کچھ اور شدید ہوگئی۔

''اکیلے ہی جاؤ گے؟''

سوٹ کیس میں میری پسندیدہ خوشبو، شیونگ باکس، ٹوتھ پیسٹ، برش اور کچھ متفرق چیزیں رکھتے ہوئے اس نے چور نظروں سے میری طرف دیکھا اور سوٹ کیس میں کچھ تلاش کرنے لگی۔ خالی سوٹ کیس تو خود اس نے الماری سے نکالا تھا۔ جھاڑ پونچھ کے بعد کپڑوں کے دو جوڑے، تولیہ، صابن، پرفیوم اور دیگر ضروری سفری سامان خود اس نے سوٹ کیس میں رکھا تھا۔ سوٹ کیس میں جس چیز کی اسے تلاش تھی وہ تو اس کے دل میں چھپی بیٹھی تھی۔ میں نے وال کلاک میں رینگتے وقت کو کوسا، ابھی ٹرین چھوٹنے میں خاصا وقت تھا۔ میری نگاہوں کے تعاقب میں اس نے بھی وال کلاک کو گھورا تو یوں لگا، کوئی تالاب کے پرسکون پانی میں پتھر پھینک رہا ہے۔

''جب میں یہاں آیا تو اکیلا ہی تھا، کوئی ساتھ ہوتا تو یوں راستے تو گم نہ ہوتے۔''

گہری سانس لے کر میں نے ٹیبل سے رسٹ واچ اٹھائی، عادتاً وال کلاک اور رسٹ واچ میں رینگتے وقت کا موازنہ نہ کیا اور رومال سے رگڑنے کے بعد کلائی پر باندھ لی۔

''گاڑی چھوٹنے میں تو ابھی بہت وقت ہے۔ تم اس قدر بے چین اور پریشان کیوں ہو؟...... کہو تو بچوں کو جگا دوں؟''

اس کے دل میں چھپی بات اب ہونٹوں تک تو آ گئی تھی، مگر اس نے خوبصورتی سے بات کا رخ بچوں کی طرف موڑ دیا۔

''رہنے، دو خواہ مخواہ ڈسٹرب ہوں گے۔ میں کون سا لمبے سفر پر جا رہا ہوں۔ تین چار روز تک لوٹ ہی آؤں گا۔ ویسے بھی بچے رات دیر سے سوئے تھے۔''

کولڈ کریم سے ہاتھوں اور چہرے پر ابھری ہلکی ہلکی لکیروں کو چھپانے کی کوشش میں مجھے یاد آیا کہ رات ٹیلی ویژن پر گمشدگی کا ایک اشتہار دیکھ کر میری حالت غیر ہونے لگی تھی۔ شاید بچوں نے میری اضطراری کیفیت کو محسوس کر کے کوئی سوال بھی کیا تھا اور میں نے انہیں ڈانٹ بھی دیا تھا۔

''تمہیں معلوم ہے رات دیر تک بچے کیا ڈسکس کرتے رہے تھے؟'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر سوٹ کیس کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا، مطمئن انداز میں سر کو جنبش دی اور شانے اچکا کر سوٹ کیس لاک کر دیا۔

''شاید وہ گمشدہ بچے کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے، جس کا اشتہار ٹیلی ویژن پر چلا تھا۔''

کرسی پر بیٹھ کر میں اپنے پاؤں موزوں میں چھپانے لگا۔

میز پر میرا شناختی کارڈ رکھتے ہوئے اس نے عجیب سے انداز میں کہا:

''اپنے شناختی کارڈ کی تجدید کرا لو...... ایکسپائر ہونے والا ہے۔'' پتہ نہیں کیوں میں نے ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں جھانک کر کچھ تلاش کرنے کی کوشش کی اور پھر اپنی ساری توجہ میز پر رکھے اپنے شناختی کارڈ پر چسپاں اپنی تصویر پر مرکوز کر دی۔ برسوں پرانی تصویر کے

سوا میرے شناختی کارڈ میں میری اور کوئی شناخت موجود ہی نہیں تھی۔ نام، ولدیت، پتہ کچھ بھی تو میرا نہیں تھا۔

''بچے مجھ سے پوچھ رہے تھے ٹیلی ویژن پر چلنے والے کسی بچے کی گمشدگی کے اشتہار سے ہمارا کیا تعلق؟''

اس نے جھاڑن سے سوٹ کیس کی غیر موجود گرد اڑائی، پھر اسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ رکھ دیا۔ ایک بار پھر وال کلاک سے آنکھیں چار کیں اور ''ناشتہ بنالوں'' کہہ کر کچن کی طرف چلی گئی۔

ٹرین کے اچانک ایک جھٹکے سے رکنے کے باعث میں اپنی سیٹ سے گرتے گرتے بچا تھا۔ کوئی چھوٹا سا غیر آباد اسٹیشن تھا جہاں گاڑی شاید سگنل ڈاؤن نہ ہونے کی وجہ سے رکی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں، میرے علاوہ تین مسافر اور بھی تھے۔ دو اوپر والے برتھ پر سو رہے تھے تیسرا میرے سامنے والے برتھ پر دراز تھا۔ ٹرین کے اس طرح اچانک رکنے پر ان کی نیند میں بھی خلل آیا تھا۔ لمبا وسل ہونے پر میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا سگنل ڈاؤن نہیں تھا۔

''شاید دوسری طرف سے کوئی ٹرین آرہی ہے۔''

میں نے اگرچہ خود کلامی کے انداز میں یہ بات کہی تھی، مگر کمپارٹمنٹ کے تینوں مسافر میری بات سنتے ہی دوبارہ اطمینان سے کمبل اوڑھ کر سو گئے تھے۔ میں نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، سورج ڈوبنے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا۔

''جب تک تو گاڑی اس شہر تک پہنچ جائے گی جہاں مجھے رات گزار کر صبح والی ٹرین سے اگلی منزل کو جانا ہے۔''

اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے میں نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں اپنے شناختی کارڈ کے لمس کو محسوس کر کے اطمینان کی سانس لی۔ اگرچہ اس میں درج میرا نام، عمر، پتہ اور ولدیت فرضی تھے، لیکن میری برسوں پرانی تصویر چسپاں ہونے کے باعث کسی بھی ہوٹل میں قیام کے لئے اجازت نامہ یہی شناختی کارڈ تو تھا اور پھر مجھے یاد بھی تو نہیں۔

میرا نام، میری ولدیت کیا ہے، میں کہاں، کب پیدا ہوا تھا؟ کسی گاؤں میں یا کسی شہر میں؟

سگنل ڈاؤن نہ ہونے کے باعث غیر آباد اسٹیشن آہستہ آہستہ آباد ہونے لگا تھا کچھا تاؤلے نوجوان ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرنے لگے۔ میں نے گرم چادر کو اچھی طرح اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور کمپارٹمنٹ سے اتر کر فٹ پاتھ پر ٹہلنے لگا۔ چھوٹا اور غیر آباد ہونے کے باعث اسٹیشن پر نہ تو چائے کا کوئی اسٹال تھا، نہ سگریٹ پان کا کوئی کھوکھا۔ ایک بوسیدہ سے کمرے میں البتہ دو چار کرسیاں پڑی تھیں۔ کھڑکی پر ٹکٹ گھر لکھا تھا۔ اسٹیشن کی پیشانی پر لکھا نام، میں کوشش کے باوجود نہ پڑھ سکا۔ ایک کرسی پر میلی چکٹ وردی میں ملبوس کوئی ہیڈ کلرک نما شخص مسلسل اونگھ رہا تھا۔ کانٹا بدلنے والا ملازم ٹرین کے گارڈ سے کسی اہم مسئلے پر مصروفِ گفتگو تھا، اس لئے میں نے ریلوے اسٹیشن کا نام معلوم کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے ایک بار پھر وقت دیکھا، سگنل پر نگاہ کی جو ابھی تک ڈاؤن نہیں تھا اور پلیٹ فارم پر کھیلتے ہوئے بچوں کی طرف توجہ کی جن کا شور ڈیزل انجن کے شور کے ساتھ مل کر اس غیر آباد ریلوے اسٹیشن کو زندگی بخش رہا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھنے لگی تھی اور سردیوں کی شاموں کی مخصوص اداسی سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ شاید ایسی ہی کوئی شام ہوگی جب کوئی ٹرین کسی گاؤں کے غیر آباد ریلوے اسٹیشن پر کسی دوسری ٹرین کو کراس دینے رکی ہوگی اور ابلتی آنکھوں کا سرخ خوف اوڑھے کوئی بچہ بھاگتے بھاگتے اس ٹرین پر سوار ہو کر اپنا نام، ولدیت اور پتہ گم کر بیٹھا ہوگا۔

اچانک میرے احساس نے منہ زور گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں، میں اسٹیشن کی عمارت سے خاصا دور نکل آیا تھا میرے سامنے کچے مکانوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں ہوا کی خنکی سے منجمد ہو رہا تھا، منڈیروں پر کھڑے بچے سسک بھی رہے تھے اور اچھل اچھل کر ٹرین کو دیکھنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ میں نے احتیاطاً ایک نظر دور کھڑی ٹرین کو دیکھا، سگنل پر نگاہ ڈالی جو ابھی تک ڈاؤن نہیں تھا اور چاہتا تھا کہ اپنا تجسس دور کرنے اس پگڈنڈی پر ہولوں جو بستی کی طرف جاتی ہے کہ اچانک کوئی شخص اونی شال اوڑھے ایک کچے مکان سے نکل کر پگڈنڈی پر دوڑتا ہوا میری طرف آنے لگا۔

جوں جوں وہ میرے قریب آرہا تھا میری حالت غیر ہوتی جارہی تھی میری دھڑکنوں میں اچانک ہی تیزی آگئی تھی، سانسیں پھولنے لگی

تھیں اور سردی کی شدت کے باوجود جسم کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا میں نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے شناختی کارڈ نکال کر اس پر چسپاں اپنی پرانی تصویر کو غور سے دیکھا اور پتہ نہیں کیوں گمان کیا کہ کچے مکان سے برآمد ہونے والا شخص، جو دوڑتا ہوا میری طرف آرہا ہے۔ میرا ہم شکل ہے۔

اتنی دیر میں وہ میرے قریب پہنچ چکا تھا اس کی سانسیں بھاری ہورہی تھیں، چہرہ لال بھبھوکا تھا اور بے پناہ سردی کے باوجود وہ بھی پسینے میں شرابور تھا۔اس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو اچانک میرے ہاتھ سے جیسے کانچ کا کوئی برتن پتھر کے فرش پر گر کر چور چور ہوگیا۔ وہ بیس، بائیس برس کا گبرو جوان تھا۔ بڑے ادب سے سلام کر کے اس نے مجھ سے یوں مصافحہ کیا اور پھر اس طرح میرا حال چال پوچھا جیسے برسوں کی شناسائی ہو مجھ سے۔ چند لمحے تو میں حیرت سے اسے تکتا رہا، پھر مایوس ہو کر اپنا شناختی کارڈ واسکٹ کی اندرونی جیب میں رکھا تو اس نے بڑی نرمی اور اپنائیت سے میرا ہاتھ تھام لیا، پھر باتوں کی ایک لمبی زنجیر، پہلے مجھے لگا تھا کہ وہ میری پہچان بن کر آئے گا، مگر اب میں سوچ رہا تھا یہ نوجوان کون ہے اور اتنی اپنائیت کیوں جتا رہا ہے۔ ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے اسٹیشن کی عمارت کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں ٹرین ابھی تک رکی ہوئی تھی۔ سورج کی زرد کرنیں اب آخری ہچکیاں لے رہی تھیں درختوں کے سائے طویل ہوتے جارہے تھے۔ وہ مسلسل باتیں کئے جارہا تھا اور میں مڑ مڑ کر دور ہوتی ہوئی بستی کو دیکھ کر ہوکرا بھرتا تھا۔ اس کی اپنائیت میرے اندر سوال بن کر اتر رہی تھی اور ایک عجیب سی بیزاری لمحہ بہ لمحہ پھیلتی جارہی تھی۔ جب ہم پلیٹ فارم پر پہنچے تو خاصا ہنگامہ تھا۔ ٹرین میں مونگ پھلی، چنے، دال، چیونگم اور کھٹی میٹھی ٹافیاں بیچنے والے بچے۔ جوان اور بوڑھے اپنی عارضی دکانیں سجائے بکری میں مصروف تھے۔ایک خالی بنچ پر بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا:

''بزرگوار، آپ کے لئے مونگ پھلی خریدوں؟''

میں نے گہری سانس لے کر نفی میں سر ہلا دیا۔ پتہ نہیں مجھے اس قدر مایوسی نے کیوں آن گھیرا تھا؟ اتنے میں دور سے ٹرین کے وسل کی آواز سنائی دی تو لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ٹرین دوسری لائن پر آکر رک گئی تھی۔ جیسے ہی پہلے سے رکی ہوئی ٹرین کے لئے سگنل ڈاؤن ہوا ایک ساتھ دو لمبے وسل ہوئے۔ پلیٹ فارم پر کھڑے گارڈ نے پوری قوت سے سیٹی بجا کر ہری جھنڈی ہوا میں لہرائی۔ دوسری ٹرین کے گارڈ نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا، مگر وہ میری نظروں سے اوجھل تھا۔تمام لوگ اب ٹرین میں سوار ہو رہے تھے۔ میں نے بنچ سے اٹھنا چاہا تو اس نے مجھے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے آہستگی سے میرا ہاتھ چھوڑا اور دوڑتے ہوئے قدموں سے ٹرین کی اسی سلیپر میں سوار ہوگیا جس سے میں سفر کر رہا تھا۔

سورج ڈوب چکا تھا اور شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ٹرین کے اندر بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ دونوں ٹرینیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں رینگنے لگیں۔ بیس بائیس برس کا نوجوان، کھڑکی کے ساتھ میری سیٹ پر بیٹھا ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے الوداع کہہ رہا تھا۔ میں اسی بنچ پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ بستی کی طرف لوٹ جاؤں یا کسی آنے والی ٹرین کا انتظار کروں جو مجھے میری منزل تک پہنچا دے۔ ❁❁

علامات قرأت کے فائدے

''علامات قرأت، یعنی پڑھنے کے نشان۔انگریزی میں چند علامتیں مقرر ہیں، جن کو 'پنکچوئیشن' کہتے ہیں۔انگریزی عبارت میں وہ نشان ہمیشہ لگائے جاتے ہیں، ان سے فائدہ یہ ہے کہ عبارت کو فصیح طور پر پڑھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ان نشانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جملہ کہاں ختم ہوا، کہاں سے دوسرا مطلب شروع ہوا؟ کون سے لفظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، کون سے علیحدہ ہیں؟ عبارت پڑھنے میں کس جگہ ٹھہرنا چاہئے، کس جگہ ملا کر پڑھنا چاہئے تاکہ مطلب، پڑھنے والے اور سننے والے کی سمجھ میں بخوبی آتا جاوے۔اس کے سوا ان نشانوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عبارت میں کون سا جملہ معترضہ ہے اور کون سا استفہامیہ؟ کون سا اقتباسیہ اور کون سا ندائیہ؟ کس مقام پر مصنف نے کوئی بات تعجب انگیز لکھی ہے اور کس مطلب پر مصنف نے پڑھنے والے کی زیادہ توجہ چاہی ہے۔'' ("علامات قرأت" سرسید احمد خاں، ص۹)

منزہ احتشام گوندل

Vice Principal, Goverment Women's College, Kotmomin
Sargodha, Punjab, Pakistan

یک بوسہ شیریں

چیخم دھاڑ کی آوازیں سن کر SHO محمود عباسی نے جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھ کر باہر جھانکا اور سامنے کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ ASI عمر افتخار ایک ملزم کو درخت کے ساتھ باندھے وحشیانہ طور پر پیٹ رہا تھا۔ عمر افتخار کے ملزم کو پیٹنے کے انداز میں نہ جانے کیا تھا کہ محمود عباسی وہیں اکڑ کر رہ گیا۔

آنکھیں بند کئے، ماتھے پر بل ڈالے وہ دونوں بازوؤں کو سر کے اوپر سے گھما کر یوں لے آتا کہ بازوؤں کی مچھلیاں پھول کر پھٹنے کو آجاتیں اور پیٹ اور اندر کی طرف پچک جاتا اور پھر سٹاک کے ساتھ ایک ضرب ملزم کی کمر پر پڑتی اور اس کی فلک شگاف چیخ بلند ہوتی۔ عمر نے آنکھوں کے ساتھ ساتھ جیسے کان بھی بند کر لئے تھے۔ وہ آج کچھ کر گزرنے کے موڈ میں تھا کہ اچانک ہی اس کی سرگرمی میں خلل آ گیا۔ یکدم تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑے اور چھتر بے اختیار اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا، عجیب وغریب، محمود عباسی نے بڑبڑاتے ہوئے منشی کو حکم دیا کہ عمر افتخار کو اس کے کمرے میں بھیجے اور خود دفتر میں جا کر بیٹھ گیا۔

''سر......'' عمر کی تھکی ہوئی آواز پر وہ چونکا۔

''آؤ عمر بیٹھو۔ آج کافی کچھ حیرت انگیز ہوا ہے۔ کافی سال سے تم فیلڈ میں ہو، مگر غیر روایتی رویے کے ساتھ۔ آج میں حیران ہوں کچھ روایتی سا انداز آ گیا ہے تم میں۔ یہ تبدیلی میری سمجھ سے باہر ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو۔ ملزم کو مارنا اور یکدم چھوڑ دینا، آئی مین کوئی مسئلہ ہے تو ڈسکس کر سکتے ہو۔ ہم دوست ہیں مجھ پر اعتبار کرو یار۔ یہ سب کچھ رزاق، منور، عبداللہ وغیرہ کرتے تو قطعاً حیرت نہ تھی مگر تم۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ پولیس آفیسر......اور یہ سب......'' محمود عباسی اپنی کرسی سے اٹھ کر چلتا چلتا اس کی کرسی کی پشت پر آ کر ٹھہر گیا۔

وقت کے بھاری لمحے خاموشی کی تہہ میں سرکتے رہے۔ عمر افتخار کسی ٹرانس میں بیٹھا رہا مگر بولا نہیں: ''چلو کوئی بات نہیں۔'' محمود عباسی نے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا۔ ''تم جا سکتے ہو مگر یاد رکھو آج شام کو کھانا ہم اکٹھے کھائیں گے۔'' عمر افتخار جانتا تھا کہ محمود کھانا اس کے ساتھ کیوں کھانا چاہتا ہے۔ وہ ایک اچھا ذمہ دار پولیس افسر تھا، فرض شناس بھی تھا۔ چند دن قبل عمر نے ایک مسئلہ بغیر کسی تشدد یا دھمکی کے حل کر دیا تھا جو گزشتہ کئی ماہ سے پولیس کو لاحل نظر آ رہا تھا۔

ہوا یوں کہ پولیس کو کئی مہینے پہلے ایک مخبر نے اطلاع دی کہ فلاں جگہ پر خانہ بدوشوں کی جھگیوں میں ایک بوڑھی عورت ہیروئن فروخت کرتی ہے۔ پولیس نے کئی مرتبہ چھاپہ مارا۔ ہر مرتبہ بوڑھی عورت کی نوجوان بہو اور پانچ بچوں کے علاوہ پولیس کو کچھ نہ ملا۔ ہر دفعہ بوڑھی عورت کچھ اس طرح سے چکر چلاتی کہ پولیس کو بے بس کر کے رکھ دیتی۔ آخری بار جب مخبری ہوئی تو ASI عمر افتخار کو بھیجا گیا۔ عمر افتخار جب واپس آیا تو اس کے ساتھ ہیروئن بھی تھی اور بوڑھی عورت بھی۔ محمود عباسی حیران تھا کہ آخر عمر نے ایسا کون سا چکر چلایا ہے اور آج اس پزل کے ساتھ ایک اور حیرت بھی مل گئی تھی۔

وہ دونوں آمنے سامنے تھے، مگر دونوں نہیں تھے، شاید تینوں تھے۔ عمر افتخار کے سامنے SHO محمود عباسی بیٹھا تھا اور SHO محمود عباسی کے سامنے ASI عمر افتخار۔ شاید ایسا ہی ہو، مگر شاید ایسا نہیں تھا۔ منتظر اور مشتاق محمود عباسی کے سامنے کھویا کھویا سا عمر افتخار تھا اور عمر افتخار کے سامنے وہ تھی۔ الٹی سیدھی بے ربط باتیں کرنے والی۔ وہ جو ہنستی تھی تو اس کے گالوں میں ہلکے پھلکے ڈمپل پڑتے تھے۔ اور تو کچھ خاص اس میں تھا نہیں، مگر پھر بھی وہ عام نہیں تھی۔ اس کی بے ربط، بے ترتیب باتوں میں

بھی ایک سلجھاؤ ہوتا تھا۔ ہمیشہ ہر وقت پر اعتماد، اپنی فضول اور لایعنی باتوں پر اعتماد رکھنے والی۔ عمر افتخار کی ہر آن بدلتی کیفیات اور اتار چڑھاؤ کی ذمہ دار وہ تھی۔ وہ اس کی رازداری کو سالم رکھنا چاہتا تھا، مگر SHO کی کریدتی ہوئی آنکھیں برمے کی طرح اس کے وجود کو چھید کر اب اس کی ہڈیوں کو چورا کرنے والی تھیں۔

وہ کہتی تھی اپنی زندگی کے ہر لمحے کو انجوائے کرو۔ جب تمھیں اپنی کسی ناکامی پر غصہ آئے تو کسی مجرم کو پکڑو اور خوب مارو تا کہ سارا غصہ باہر نکل جائے اور اس مار پیٹ کے عمل کو بھی انجوائے کرو۔ اس سے لطف اٹھاؤ اور جب میں ہیروئن بیچنے والی بوڑھی عورت کے گھر چھاپہ مارنے گیا تو بوڑھی روپوش ہو چکی تھی، مگر اس کی نوجوان بہو اور بچے اس کی جھگی کے اندر رہ گئے تھے۔ اس سے قبل کہ میں بھی باقی پولیس والوں کی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹ جاتا یا نوجوان عورت کو پکڑ کر تھانے میں لے آتا، اس کے کہے یہ جملے میرے دماغ میں گونجنے لگے۔

''اپنی زندگی کے ہر لمحے کو انجوائے کرو۔''

میں اچانک پلٹا اور میں نے اپنے ساتھ اپنے ماتحتوں کو اور نوجوان عورت کے بچوں کو جھگی سے باہر بھیجا، تا کہ تخلیے میں بوڑھی عورت کی بہو سے کچھ سوال جواب کر سکوں۔ جب سب باہر چلے گئے اور جھگی کے اندر میں اور نوجوان عورت تنہا رہ گئے تو میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور عورت کی طرف پلٹا۔ وہ تو جیسے صدیوں سے اسی لمحے کی منتظر تھی۔ کٹی ہوئی ڈال کی طرح میری گود میں آ گری۔ میں نے اس کے ہونٹوں کا ایک بوسہ لیا تو اس نے فر فر سارا کچھ مجھے بتا دیا۔ اس کا شوہر یعنی بوڑھی عورت کا بیٹا چھ ماہ سے جیل میں تھا اور بوڑھی عورت ہیروئن بیچ کر اس کا اور اس کے بچوں کا پیٹ پالتی تھی۔ اس نے نہ صرف اپنی ساس کا ٹھکانہ بتا دیا بلکہ ہیروئن جو چھپا کر رکھی تھی وہ بھی نکال کر دے دی۔ میں نے تو بس لمحہ بھر انجوائے کرنے کی غرض سے...... وہ سب...... مگر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس عورت کو تھانے میں لا کر چاہے کتنا ہی تشدد کیوں نہ کرتا، وہ کبھی بھی نہ مانتی۔

اس کی اوٹ پٹانگ باتیں نہ جانے کہاں کہاں مجھے یاد آتی ہیں۔ وہ کہتی تھی: ''پولیس والے! چوروں اور ڈاکوؤں کو اور عورتوں کو تنگ کرنے والوں کو خوب زور زور سے مارا کرو۔ جب تم مار رہے ہو گے تو میں تصور کی آنکھ سے دیکھوں گی کہ ڈنڈے پر گرفت کی شدت سے تمھاری انگلیوں کے ناخنوں میں لہو سمٹ آیا ہے اور وہ جامنی پڑ گئے ہیں۔ تمھاری کلائیوں اور ہاتھوں کی رگیں ابھر آئی ہیں۔ تمھارا چہرہ سرخ ہو گیا ہے اور سینے کے جھاڑ جھنگاڑ میں زلزلہ آ گیا ہے اور اس کے بعد پتا ہے کہ میں کیا تصور کروں گی؟ میں سوچوں گی کہ یہ ہاتھ جن کی رگیں ابھر آئی ہیں اور جن کے ناخن جامنی رنگ کے ہو گئے ہیں، جو اس وقت کسی مجرم کے بدن پر تشدد کر رہے ہیں، یہ ہاتھ کسی کے نازک کانوں کے خوبصورت بالے کو چھو کر محسوس بھی تو کر سکتے ہیں۔ ان کے اندر احساس کی ریشمی برقی لہریں بھی تو دوڑ سکتی ہیں۔ یہ کسی نازک بدن کو کسی دوسری انتہا پر جا کر چھو کر محسوس کر کے اس کے اندر سنسنی بھی تو دوڑا سکتے ہیں اور یہ چہرہ جس کا دوران خون جسم کو سرخ اور گرم کر رہا ہے، یہ گرمی اور سرخی کسی دوسرے احساس کی وجہ سے بھی تو ہو سکتی ہے کہ اپنے پاس سے آنے والے نرم سانسوں کو بھی پگھلا کر رکھ دے اور یہ سینہ جو غصے اور طاقت کی شدت سے لرز رہا ہے، محبت کے نرم اور مخمور جذبات سے بھی تو لرز سکتا ہے۔''

او ہو عمر افتخار! کیا مجرم کا جسم اور محبوبہ کا بدن ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں؟ کیا دونوں ہی طاقت کے اخراج کا محض ایک ذریعہ ہیں۔ نہیں نا...... تو پھر اتنی مشابہت کیوں ہے؟ یہ Treatment کی دو انتہائیں ہیں۔ مجرم کا بدن شدت اور محبوبہ کا لطافت...... مگر تمھاری حالت دونوں ہی دفعہ ایک سی کیوں......؟''

''معلوم نہیں سر! اب میں جب بھی تشدد کرنے لگتا ہوں تو کہیں بیچ میں وہ آ جاتی ہے۔ میرے ہاتھ سے ڈنڈا سرک جاتا ہے، اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور ہاتھ کسی نازک کان کے خوبصورت بالے کو چھونے کی آرزو میں دہکنے لگتے ہیں۔ چہرہ کسی کی قربت سے اٹھنے والی آنچ سے سلگنے لگتا ہے اور میرے لہو کے کروڑ ہا خلیوں کے اندر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں ہم انسان نہیں ہیں۔ ہمارے نام کے ساتھ صحافی حضرات وحشیانہ، بہیمانہ، جیسے نامعقول الفاظ چسپاں کرتے ہیں۔ مائیں بچوں کو ہمارے نام لے لے کر ڈراتی ہیں، مگر لوگ نہیں جانتے کہ ان کے درمیان وہ بھی رہتی ہے جو ہمارے تشدد

کرتے جسموں اور بگڑے ہوں چہروں کے اندر سے بھی حسن اور احساس تلاش لیتی ہے۔''

کیا اب تک کی گزری ہوئی انسانی تاریخ میں مجھ سے پہلے بھی مجھ جیسی ذہنی اور جسمانی طور پر بھرپور عورتیں ناقابل یقین حد تک تکلیف وہ ذہنی اذیتوں سے گزاری جاتی رہی ہیں۔ اس مفروضے کے امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً اپنی اپنی سطح پر اپنے اپنے دور کا ہر اوچھا ہتھکنڈہ اور وار آزمایا جاتا رہا ہوگا۔ عورت نفسیاتی اور جسمانی سطح پر کتنی ہی مکمل اور بھرپور کیوں نہ ہو، جب تک معاشرے کے مروجہ اور عام منافقانہ انداز مکمل طور پر نہیں سیکھ جاتی وہ آزمائی جاتی رہے گی۔ کیا میں جو کہنا چاہتی ہوں وہ ٹکڑوں ٹکڑوں میں نہیں ابلاغ ہو سکتا تا کہ ایک کولاج بن جائے۔ اب تک کتنی مشکل کے ساتھ اپنی شخصیت کی بے ربطی کو میں نے مربوط اور بے ضابطگی کو منضبط رکھا ہوا ہے۔ اپنے قول و فعل میں ہمیشہ میں جس عدم توازن کی مظہر رہی ہوں تحریر میں کیوں نہیں ہو سکتی۔

''وہ کہتے ہیں'' لفظوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کرو۔ لفظ بڑے منتقم مزاج ہوتے ہیں۔ یہ انتقام بھی لیتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جگہ بد احتیاطی سے استعمال کئے گئے تمہارے لفظ گلے کا پھندہ بن جائیں اور میں کچھ بھی بے احتیاطی سے استعمال نہیں کرتی...... ہاں، مگر لفظ......

سوچ کدھر بھٹکتی ہے...... جدھر بھی...... بھٹکنے دو۔

سوچ کی آوارگی کیا آوارگی نہیں ہے؟...... نہیں ہے۔

گوتم بدھ کے سنگی مجسمے کے سامنے کنول آسن بٹھائے وہ مراقبے کی کسی کڑی خود احتسابی منزل سے گزر رہی تھی کہ اسے کندھے پر کسی کی انگلیوں کی گرفت کا احساس ہوا۔ آنکھیں کھولے بغیر ہی اس نے جان لینا چاہا کہ کون ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا وہی دوست ہے جو ایک ادھورا اور ان کھلا منافق ہے۔ ''تم چلو میں آتی ہوں۔''

اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ سامنے بیٹھے گوتم کو دیکھا۔ گوتم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ گوتم کے موٹے موٹے ہونٹوں کی مشابہت سے اس کے وجدان نے ٹھوکر کھائی۔ گوتم کے ہونٹوں کی مشابہت اور مسکراہٹ...... وہ حال کا لمحہ اور ماضی کا کوئی لمحہ...... مل کر ایک دم حال کے لمحے کی کوکھ میں اترے۔ کیا سارے زمانے یکجا ہو سکتے ہیں۔؟ ہو بھی سکتے ہیں بلکہ ہو رہے ہیں۔ گوتم کے موٹے موٹے ہونٹ...... مسکراہٹ یہ سب کہیں خلط ملط ہو رہے ہیں ایک پیکر اس کے اندر ڈھلتا ہے، سماتا ہے اور پھر نکلتا ہے...... وہ ایک منٹ کا شاید دسواں حصہ تھا۔ جب اس کی ساری حسیں ایک ہی نقطے پر یکسو ہوگئی تھیں۔ احساس کی نرم چادر پورے بدن کے ساتھ لپٹ گئی تھی۔

گوتم اب اسے گھور کر دیکھ رہا ہے۔ آنکھ میں شناسائی کا چکر ہے۔ وہ آنکھ چرا جاتی ہے۔ کنول آسن ڈالے گوتم کے آسن کے وسط میں جاتا ہے، اس کا دماغ ٹھوکر کھاتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے ازمیر کی اور اس کی لڑائی اور جنگ و جلال۔

یونہی بیٹھے بٹھائے...... ''گوتم بدھ''، ''اسلم انصاری'' کی نظم ''تمام دکھ ہے'' سے بات چل نکلی تھی۔

''یار کبھی کبھی مجھے لگتا ہے...... گوتم بدھ impotent تھا۔''

''کیا مطلب؟'' وہ حیران ہوئی مگر اس کی بیوی ''یشودھرا اور بچہ...... کیا سمجھتے ہو تم کہ......''

''نہیں نہیں یار۔ دیکھو یوں بارہ سال تک ایک ہی آسن میں بیٹھے رہنا I Think Not کہ کوئی نارمل مرد بیٹھ سکتا ہو......'' وہ کچھ الجھ سا گیا میں اکثر سوچتا ہوں۔

''وہ نارمل مرد تھا کب؟ وہ ایک غیر معمولی مرد تھا اور اس کا کمال یہی تھا کہ وہ ایک نوجوان بیوی اور بچے کو چھوڑ کر آیا۔ پوری قوت ارادی کے ساتھ بیٹھا رہا اور جب نجات پا گیا تو پھر انہیں لوگوں کی طرف، اسی بھرپور زندگی کی طرف لوٹ گیا۔ کیا یہ ہجرت اور مراجعت تمہیں ایک عام سی چیز لگتی ہے؟''

''ہجرت اور مراجعت نہیں معراج کہو یار...... یہ اس کی معراج تھی ہاں اور اگر تمہاری بات مان لی جائے تو ایک بہت بڑے thesis کا Anti thesis ہو جاتا ہے۔ وہ اگر Impotent تھا، پھر تو اس کی ساری سرگرمی اور ریاضت ایک عام آدمی کی سرگرمی ہوگئی۔ اس میں خاص تو کچھ رہا نہیں پھر...... اور اس thesis کا Anti thesis نہیں ہونا چاہیے۔ تمہارے جیسے سرپھروں کو اخلاقاً قانوناً کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ کروڑوں لوگوں کی عقیدت کا مذاق اڑائیں۔''

گوتم بدھ کے ہونٹ اور مسکراہٹ......وہ پوری آنکھیں کھول کر ماضی کے اس لمحے کی گرفت کو حال میں کھینچ لائی......آوازوں پر آوازیں پڑ رہی تھیں۔تلملا کر اس نے دیکھا۔ پورا تعلیمی یونٹ اسے گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔

''کم بخت ایک تو یہ لوگ جان نہیں چھوڑتے۔ آدمی اس دنیا میں تنہا کیوں نہیں ہے؟'' کھانے کی بے ڈھنگی کوشش کے دوران اس نے سامنے بیٹھے بلال سے سوال کیا:

''کیا کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ماضی کا کوئی گزرا ہوا لمحہ حال کے لمحے میں آکر پیوست ہو جائے اور کسی زندہ انسان کی شبیہ کسی معروف مذہبی نمائندہ مجسمے کے اندر سما جائے؟''

''ہاں ہو سکتا ہے۔ تمہیں دن دہاڑے التباس نظر ہو رہا ہے۔ نہیں۔ نہیں تو......تم میری ذہنی اذیت کے مرحلہ وار اسباب کو تو جانتے ہو نا؟ وہ پورا سینا ریو تمہارے سامنے ہے۔ ایک Situation تمہیں دیتی ہوں ذرا غور کرنا......میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی مجھے پکڑے اور انہیں بھی (میرے محبوب کو)......اور ہم دونوں کو کسی وسیع و عریض چھٹے پر رکھ کر ہم دونوں کا قیمہ بنا کر آپس میں یوں ملا دے جیسے گندم کے دانوں کی انفرادیت پسے ہوئے آٹے کی اجتماعیت میں بدل جاتی ہے اور میری اس انتہائی شدید خواہش کا پتا اگر میرے دشمن (رقیب) کو لگے تو سوچو اس کی کیا حالت ہو۔''

''اس بے چارے کے جذبۂ انتقام کی تو ماں......''

بلال نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا۔

عمر افتخار......ایک پڑھا لکھا نوجوان پولیس آفیسر CSS کی معلومات پر انحصار کرنے والا، تشدد کی بجائے مذاکرات پر یقین رکھنے والا، بودا بچہ نہ جانے کچھ عرصے سے اتنا تشدد پسند کیسے ہو گیا ہے۔ عجیب وغریب بات تھی محبت انسان کو تشدد پسند بھی بنا سکتی ہے۔ شام کے کھانے کے بعد محمود عباسی ابھی تک کھانے کی میز پر بیٹھا تھا اور مسلسل اس ان دیکھی لڑکی کو سوچے جا رہا تھا۔ عابد سپاہی نے کئی بار کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا، مگر ہر بار اس کو خاموشی سے سوچوں میں گم سگریٹ کے کش لگاتے دیکھ کر چپ چاپ واپس لوٹ گیا۔ لگتا ہے صاحب کے پاس کوئی مشکل کیس آ گیا ہے۔ عابد جانے کیوں بار بار صاحب کا دروازہ کھول بند کر رہا ہے۔ سپاہی شبیر نے سوچا۔ سوچ کیسے ایک فرد سے دوسرے فرد تک سفر کرتی ہے۔ سوچ کے اندر کتنے امکانات ہیں، کتنے گمان ہیں۔ عمر افتخار اس کو سوچتا ہے۔ محمود عباسی، عمر افتخار کو سوچتا ہے، محمود عباسی کو عابد سپاہی اور عابد سپاہی کو شبیر سپاہی بھی سوچتا ہے۔ شبیر سپاہی کو بھی کوئی سوچتا ہوگا......امکانات کا سلسلہ لامحدود ہے۔

وہ لڑکی عمر افتخار کی ان نفسیاتی وجوہات کی محرک ہے۔ یہ بے وقوف اس سے محبت کرنے لگا ہے اور وہ اس کی محبت کو تسلیم نہیں کرتی۔ تبھی اتنی آزادی سے اس کے ساتھ آزادانہ بک بک جھک جھک کرتی رہتی ہے اور یہ بے وقوف سیریس ہوتا رہتا ہے۔ میں اس کو سمجھاؤں گا۔ ہاں ضرور سمجھاؤں گا اور پھر کسی فیصلے پر پہنچ کر وہ یکدم مطمئن ہو کر بستر پر چلا گیا۔

آج ان کے تعلیمی دورے کا آخری دن تھا۔ وہ آخری مرتبہ گوتم بدھ کے اس سنگی مجسمے کے سامنے بیٹھ کر سیمیائی طلسم دیکھنا چاہتی تھی تا کہ کسی کے پیکر کو گوتم کے مجسمے میں ڈھلتے اور پھر نکلتے دیکھ سکے اور اس لمحے میں گوتم کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں کی رسالت میں قید کرے کہ اتنے میں موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ عمر افتخار کا فون تھا۔

''کہاں ہو؟ کیا کر رہی ہو؟''

''پہاڑوں میں ہوں......پوجا پاٹھ کر رہی ہوں......تم سناؤ؟ ہاں بس ٹھیک۔ تمہیں ایک واقعہ سنانے کے لئے فون کیا ہے۔''

''تو سناؤ۔''

''بدصورتیوں میں سے خوبصورتیاں تلاش کرنا، پہاڑوں کے اندر جھرنے ڈھونڈنا، مٹی کی گہری تہوں سے سونا اور ہیرے تلاشنا اور سنگی مجسموں کے اندر روح لپکنے کے انتظار میں رہنا تمہارا مشغلہ ہے نا'' وہ عجیب سے انداز میں بول رہا تھا جیسے دکھی بھی ہو اور طنز بھی کر رہا ہو۔

''ہاں......'' اس نے مختصر جواب دیا۔

تتلی کو پکڑ کر بچے کیوں مسل ڈالتے ہیں؟ پھول کو توڑ کر مرجھانے کے لئے کیوں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ عورت کے بدن کا سب سے خوبصورت، نازک

(بقیہ ص ۶۸ پر)

صدف احمد زبیری

C/o Ahmed Mehar Zubairai, Po box 1948, Pc 112, Ruwi
Muscat, Sultanate of Oman

ہم نفس

آج سے ایک کم چالیس برس پہلے جب میں اُس کے سنگ رخصت ہو کر اس گھر میں آئی تھی تو وہ میرے لئے بالکل اجنبی تھا اور پھر اگلے اٹھارہ برس وہ میرے لئے اجنبی ہی رہا۔ ہماری زندگی کا آغاز بالکل بھی عام لوگوں جیسا نہیں تھا۔ نہ شادی کے اوّلین دنوں والی شوخیاں، نہ محبت بھری سرگوشیاں، نہ روٹھنا نہ منانا، ضرورت تک محدود یہ تعلق بہت عجیب سا تھا۔ اس کے پتھریلے پہاڑ جیسے دل کو کھولنے والے کھل جا سم سم کے منتر کو میں کبھی جان ہی نہ پائی۔ شہر کی مضافاتی بستی کی جن تنگ گلیوں سے میں رخصت ہو کر آئی تھی، انہی جیسی دوسری گلیوں میں آبسی۔ یہاں سب ریڑھی بان، سبزی فروش یا نچلے درجہ کے ہنر مند لوگ تھے۔ وہ بھی اپنا ٹھیلا لے کر صبح سویرے نکل جاتا اور دن ڈھلے باسی روٹی کے ٹکڑوں، پلاسٹک کے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں اور ردّی کاغذوں کے ساتھ داخل ہوتا، شروع دنوں میں مجھے ہمیشہ اُمید رہتی شاید اس کے ہاتھ میں میٹھا پان، کانچ کی چوڑیاں یا دہی بھلوں کی تھیلی ہو، مگر یہ ہمیشہ اُمید ہی رہی۔ وہ باہر سے آتا اور اپنی ماں کے پاس بیٹھ جاتا۔ اس کی ماں ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہی، گھر کے دوسرے حصوں کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے چھوٹے سے کمرے میں جہیز کے پلنگ پر بھی ہمارے درمیان موجود ہوتی۔

''اماں سن لے گی.....''

''اماں کو برا لگے گا.....''

''اماں کو یہ بات بالکل پسند نہیں...... ''

یہ وہ چند جملے تھے جو ہمیشہ میرے اور اس کے درمیان موجود رہتے، بہت جلد اس سے اُکتا کر میں نے کاٹھ کباڑ کے کام میں پناہ ڈھونڈ لی۔ ہر روز میں گزشتہ دن کے کاٹھ کباڑ کو علیحدہ کرتی، اُنہیں مختلف بوریوں میں بھرتی، روٹی کے باسی ٹکڑوں کو مزید سکھاتی۔ لوہے، پلاسٹک اور ردی کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر کے اسے اس کی ماں کے ساتھ چھوڑ کر اپنی ٹوٹی کمر اور ازلی تنہائی کو لے کر پڑ جاتی۔ آٹھ سالوں میں اپنے تین پوتوں کا منھ دیکھ کر اس کی ماں جنت نصیب ہوگئی۔ شاید یہاں میرے اکیلے پن کا اختتام ہو ہی جاتا اگر اُسے میں نظر آتی، مگر ہمارے درمیان وہی اجنبیت کا تعلق قائم رہا، وہ صبح سویرے نکل جاتا اور شام کو خاموشی کے ساتھ اپنے بستر پر پڑا رہتا، اسی طرح روکھے پھیکے اگلے چار سالوں میں اس کا باپ بھی رخصت ہوا۔ گیارہ سالوں میں دو بیٹیوں کا اضافہ اور ہوا اور اب میں پانچ بچوں کے ساتھ تھا اسّی گز کے اس پورے گھر کی مالک تھی۔ کاروبار بھی اب بہتر جا رہا تھا، گلی گلی ٹھیلا لے کر جانے کے بجائے اب اس نے گلی کے نکڑ والا پلاٹ خرید لیا تھا، اب ہمارے اپنے چار ٹھیلے چل رہے تھے، کئی کچرا چننے والے بچے بھی کام پر رکھ لئے تھے اور وہ خود اب باقاعدہ کباڑیا بن گیا تھا۔ روٹی، سبزی کے ساتھ اب ہفتے میں دو دن گوشت بھی پکنے لگا، بچے سرکاری اسکولوں میں جانے لگے، حالات میں بہتری آئی تو فاصلے بھی کم ہونے لگے۔ اماں کے نکل جانے سے جو خالی جگہ پیدا ہوگئی تھی وہ آہستہ آہستہ بھرنے لگی، میں اسے گلی محلے کے قصے چٹخارے لے لے کر سناتی، رشتہ داروں کی کمینگی کو بڑھا چڑھا کر بتاتی۔ اپنی سلیقہ مندی اور بچوں کی بہترین تربیت کے گن گاتی، پتا نہیں کہ وہ سنتا تھا کہ نہیں، مگر غنیمت تھا کہ وہ چپ چاپ میرے پاس بیٹھا رہتا، یا پھر تھک کر اپنے داہنے بازو کو آنکھوں پر رکھ کر لیٹ جاتا۔ میں کبھی اس کے دل کا حال جان ہی نہ پائی، کبھی میں شوخ ہو جاتی اور حسرت سے پوچھتی:

''سچ سچ بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو.....؟''

مگر اس کا ایک ہی جواب ہوتا:

''پاگل ہے کیا.....سونے دے.....''

یوں ہمارے ازدواجی تعلق کو اٹھارہ سال بیت گئے اور ان اٹھارہ سالوں میں ایک دن پہلی بار اس نے مجھ سے پوچھا:

''کچھ چاہیے تجھے..... بتا کیا لے گی.....؟''

وہ شاید خوشی یا حیرت کا ایک لمحہ تھا، مجھے کیا چاہیے تھا؟ اتنے سالوں میں میری خواہشیں دہی بھلوں، میٹھے پان اور کانچ کی چوڑیوں سے آگے کبھی گئی ہی نہیں تھیں اب جو اس نے پوچھا تو میں سوچ میں پڑ گئی۔

کیا مانگوں؟ سونے کی انگوٹھی.....جیسی بھائی جان نے بھابی کو اوپر تلے پانچ بیٹیاں پیدا کرنے کے بعد بیٹے کی پیدائش پر دی تھی۔ مجھے تو گھر کے اتنے بہت سے کام کرنے ہوتے تھے زیور کیسے پہن سکتی تھی، ریشمی جوڑوں کی مجھے عادت نہیں تھی، اُس کے ساتھ باہر جا کر کھانا کھانے کی خواہش بھی اکثر دل میں اٹھتی، مگر یہ وہ ماننے والا نہیں تھا، ہماری برادری میں عورتوں کو باہر لے جانے کا رواج ہی نہیں ہے، میں ہمیشہ یہی سوچتی کہ وہ میری فرمائشیں پوری نہیں کرتا اور آج جب اس نے پوچھا تو مجھے خیال آیا کہ میری تو کوئی خواہش ہی نہیں اور میں اس موقع کو گنوانا بھی نہیں چاہتی تھی بالآخر بہت سوچ کر میں نے کہا کہ وہ مجھے اپنے بزنس میں شامل کرلے اب کی بار اس کی آنکھوں میں حیرت دیکھنے والی تھی۔

''تو بجنس کرے گی.....''

وہ ہنسنے لگا اور یوں ہنستے ہوئے، میرے قریب بیٹھے ہوئے، اس طرح مجھ سے باتیں کرتے ہوئے کتنا خوبصورت لگ رہا تھا۔ اتنا خوبصورت، اتنا اپنا سا کہ وہ اجنبیت جو اٹھارہ سالوں سے کسی عفریت کی طرح ہمارے درمیان موجود تھی جیسے یکدم ہی غائب ہوگئی۔

''ہاں تو تم گھر میں جو کام مجھے لا کر دیتے ہو اس میں سے بھوسی ٹکڑے مجھے دے دو۔'' وہ اور زیادہ حیران ہوا:

''بھوسی ٹکڑوں کا کیا کرے گی تو؟''

''میں جو بھی کروں، رکھوں یا بیچوں وہ میرے ہوئے۔''

یہ ایک قیمتی موقع تھا میں کیسے گنوا دیتی، وہ مان گیا۔ یوں میں اس کے بزنس میں بھوسی ٹکڑوں کی ساجھے دار بن گئی، جوں جوں اس کا کام بڑھتا گیا بھوسی ٹکڑے بھی بڑھتے گئے، پہلے میں نے یونہی بلا سوچے سمجھے ایک بات کہی تھی میں ان ٹکڑوں کو بکریوں کو ڈال دیتی یا نرم کر کے پانی میں بھگو کر چھت پر مٹی کے کونڈے میں رکھ آتی پرندوں کے لئے، مگر جب ان کی تعداد بڑھنے لگی تو میں نے انہیں بیچنا شروع کر دیا، ابتدا میں ایک ہفتے میں چار پانچ روپے تک جمع ہو جاتے، پھر آہستہ آہستہ رقم بڑھنے لگی، وہ اتنا مہنگائی کا زمانہ نہیں تھا، مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس رقم کا کیا کروں، پھر ایک دن پڑوس کی فریدہ اپنا ٹوٹا ہوا سونے کا چھلا بیچنے لگی۔ اسے پیسوں کی ضرورت تھی اور سُنار بہت کم رقم دے رہا تھا، ذرا سی زائد رقم دے کر فریدہ سے وہ چھلا میں نے خرید لیا اور اسے جہیز کی اس بالشت بھر کی اس صندوقچی میں رکھ دیا جو ماں نے میری شادی پر خاص طور سے بنوا کر دی تھی کہ اس میں برے وقت کے لئے کچھ بچا کر رکھوں، پھر جیسے مجھے اس صندوقچی کو بھرنے میں مزہ آنے لگا، جب میرے پاس کچھ رقم جمع ہو جاتی، میں کوئی نہ کوئی پرانا زیور خرید کر اس میں برے وقت کے لئے ڈال دیتی۔ یوں ایک کم چالیس سال گزر گئے، میرے اور اس کے بیچ کی اجنبیت تقریباً ختم ہو چکی تھی، بیٹیاں بیاہی گئیں اور بہوئیں آگئیں۔ پوتی پوتے انگلش اسکولوں میں پڑھنے لگے، محلّہ وہی پرانا تھا اور وہ اس محلے کا سب سے پرانا کباڑی تھا، حالات بدل گئے تھے، مگر اب اسے شناخت بدلنے کی لگ گئی تھی۔

''جسے دیکھو کباڑ یا کباڑیا، نفرت ہوگئی ہے مجھے اس لفظ سے۔''

وہ غصے میں چلاتا، حالانکہ اس میں کوئی حرج نہیں تھا، ہم نے عزت کی زندگی گزاری تھی، بہت ساروں سے بہت بہتر، کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی، لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نسلیں کباڑیے کے نام سے مشہور ہوں، مگر اس کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا؟

''میں پرانے فرنیچر کا کام کروں گا، اب میں کباڑ کی جگہ پرانا فرنیچر خریدوں گا اور اُسے نیا کر کے کم داموں میں بیچ دیا کروں گا، تاکہ یہ منحوس کباڑیے کا لفظ ہمارے نام کے آگے سے ہٹ سکے۔''

اس نے ارادہ کر لیا تھا اور میں اور میرے بیٹے اس کے ساتھ تھے ہمیشہ کی طرح۔

انہی دنوں پتا چلا کہ علاقے کی سب سے بڑی پرانے فرنیچر کی دکان کا مالک اپنے بیٹوں کے پاس باہر ملک شفٹ ہو رہا ہے اور دُکان کو

فوری طور پر فروخت کر رہا ہے، قیمت بھی مناسب مانگ رہا تھا، لیکن یہ مناسب قیمت بھی ہماری پہنچ سے باہر تھی، ہم بہت عرصے سے اپنا کام کر رہے تھے، مگر تھے تو کباڑیے، اتنی بڑی رقم کا بندوبست کیسے کر سکتے تھے، مگر یہ بات اسے سمجھ ہی میں نہیں آ رہی تھی۔ اس پر جیسے کوئی نشہ سوار تھا، عمر کے آخری حصے میں اسے یہ کام کرنا ہی تھا، وہ کچھ سننے کو تیار نہیں تھا، زندگی بھر کی جمع پونجی داؤ پر لگانے پر تلا ہوا تھا اور اس سب کے بعد بھی قیمت ہماری پہنچ سے باہر تھی، پھر کچھ دن کی خاموشی کے بعد اس نے بتایا کہ وہ بیعانہ ادا کر چکا ہے اور اب دو دن کے بعد اسے ہر حال میں پوری رقم کی ادائیگی کرنی ہے، سارا انتظام وہ کر چکا تھا اب صرف پانچ لاکھ روپے کم تھے۔

''مگر ابا ہم پانچ لاکھ کہاں سے لائیں گے اور اتنی رقم تو کوئی اُدھار بھی نہیں دے گا۔''

یہ میرا منجھلا بیٹا تھا، مگر اس نے سنا ہی نہیں، وہ سنتا کب تھا، وہ سب کچھ پہلے ہی سوچ چکا تھا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا:

''لا مجھے پانچ لاکھ لا کر دے۔''

''میں؟ مگر کیسے میرے پاس اتنے روپے نہیں ہیں۔''

میں نے بتانے کی کوشش کی مگر وہ تو جیسے پاگل ہو گیا، تیرے پاس نہیں تو کس کے پاس ہیں بیس سال سے جو بـجنس کر رہی تھی، میرا دیا کھا رہی تھی، کیا وہ اپنے یار پر لٹا بیٹھی ہے۔

میں اس کے منھ سے یہ الفاظ پہلی بار سن رہی تھی اور جیسے حق دق بیٹھی تھی اس کی آنکھیں، اس کا لہجہ، آواز سب کچھ بدل چکے تھے۔

وہ...... وہ نہیں تھا جس کے ساتھ میں پچھلے بیس سال سے رہ رہی تھی وہ...... وہ تھا جس کے ساتھ میں ایک کم چالیس برس پہلے بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی۔

کوئی اجنبی...... نہیں وہ اجنبی تو خاموش رہتا تھا، جب کہ اس کی زبان زہر اُگل رہی تھی، لفظوں کے ناگ مجھے ڈس رہے تھے۔ میں نے بولنا چاہا، مگر حلق خشک ہو چکا تھا، وہ چلا رہا تھا۔ مسلسل بے تکان۔ میں جیسے کھلے آسمان تلے کھڑی تھی اور جاڑے کی سرد رات میں میرے سر اولے پڑ رہے تھے۔ سن ہوتی سماعتوں نے کچھ سنا۔ ہاں شاید نہیں یقیناً وہ یہی بول رہا تھا:

''اب تو یہاں کیا کر رہی ہے، تو بھی وہاں جا جہاں اپنا مال پہنچایا ہے، مکار عورت جا تین طلاقیں ہیں تجھے، کوئی تعلق نہیں تیرا میرا۔''

یہ الفاظ تھے...... نہیں کوڑے تھے...... میں بولنا چاہتی تھی۔ بتانا چاہتی تھی...... میرے پاس روپے نہیں...... پرانا زیور ہے جو میں پہلے ہی جہیز کی صندوقچی میں اس کے کپڑوں کی الماری میں رکھ چکی ہوں، میں بتانا چاہتی تھی کہ یہ میں نے برے وقت کے لئے رکھا تھا اور اس سے برا وقت کیا ہو سکتا تھا، کہ اس کی سب سے بڑی خواہش پوری نہ ہو سکے...... میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس کے کہے بغیر ہی اس کی خواہش جان چکی ہوں، مگر وہ سنتا ہی کب تھا، میں اس کے لئے ایک اجنبی ہی رہی، اس نے میرے الفاظ کبھی نہیں سنے تو خاموشی کیسے سنتا، برسوں کا ساتھ تھا گھنٹہ بھی نہیں لگا ختم ہونے میں۔

ایمبولینس بھی آئی، میں ہسپتال بھی گئی، سفید کفن میں لپٹا بھی دی گئی اور خاموشی سے سنتی رہی آس پاس والی عورتیں مجھے بتا رہی تھیں کہ میں خوش قسمت ہوں کہ میری مٹی خراب ہونے سے بچ گئی، ورنہ اس عمر میں طلاق کے بعد کہاں جاتی، میں مر گئی یہ میرے حق میں بہتر ہوا، میں مٹی کی امانت تھی اور اس کے سپرد ہوئی، یوں میری کہانی ختم ہو گئی۔

لیکن کیا واقعی؟

وہ تیسرا دن تھا جب وہ میری قبر پر پہلی بار آیا، اسے میرے جہیز کی صندوقچی مل گئی تھی اور زیوارت بھی......

وہ جان گیا تھا، کڑی سے کڑی ملتی چلی گئی، اب وہ روز میری قبر پر آتا ہے، اس کا ماس تیزی سے ہڈیوں کو چھوڑ رہا ہے، وہ ہر روز پہلے سے زیادہ بوڑھا ہو رہا ہے، وہ جس نے کبھی مجھ سے ڈھنگ سے بات نہیں کی تھی وہ اب گھنٹوں مجھ سے باتیں کرتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں اس کی ہڈیوں میں بیٹھ گئی ہوں، اسے وہ ایک کم چالیس سال بھول گئے ہیں ہمارے بچے، رفاقتوں کے لمحے، میری بے سروپا باتیں بھی بھول گئی ہیں حد تو یہ ہے وہ ''بـجنس'' بھی بھول گیا ہے جو اس سارے فساد کی جڑ بنا۔ اپنی شناخت، نیچ ذات اور معاشرے میں بلند مقام تک بھول گیا ہے،

(بقیہ ص ۵۳ پر)

آنند لہر

H.No. 19, Bakshi Nagar, Dist Jammu Tavi 180001 (J&K)

الگ صوبہ

بلاتکار کے واقعے اتنے زیادہ ہوگئے کہ جانوروں کو اپنی جانوریت خطرے میں لگنے لگی، لہٰذا جانوریت کو بچانے کے لئے جانوروں نے ایک بہت بڑے اجلاس کے اہتمام کا فیصلہ کیا اور ساتھ میں تمام جانوروں سے کہا گیا کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو نہ بتائیں کیونکہ انسانیت کو بچانے کے لئے جو کانفرنس منعقد کرنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا وہ اندرونی تضاد کی نذر ہوگیا اور اس کی وجہ سے ایک اور فساد ہوا جس میں پہلے فساد کی طرح ہی سہاگنوں کے سہاگ اجڑے اور بچے یتیم ہوئے، پھر جانوریت کو بچانے کے لئے پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر جانور اکٹھے ہوئے کیونکہ جانوریت کے اصولوں کے مطابق وہ انسانوں کے بے وجہ لڑنے کو حماقت سمجھتے ہیں، کیونکہ جانوروں میں دوسرے کی مرضی کے بغیر کسی کو کوئی چھونہیں سکتا ہے، اس لئے مادہ جانور بھی شامل ہوئے اور پھر کانفرنس شروع ہوگئی۔

ہاتھی نے کہا:

''اب چوہا اس کانفرنس کا افتتاح اور بِلّا اس کی صدارت کرے گا'' پھر چوہے نے اپنی تقریر کچھ یوں شروع کی:

''انسان جانتا ہے اور مانتا ہے کہ جانور اس کا باپ ہے، مگر اس کے اصولوں پر چل نہیں رہا ہے۔ جانور کبھی درخت نہیں اجاڑتے، زمین پر دھواں نہیں پھیلاتے، جنگ نہیں کرتے، بغیر بھوک کے ایک دوسرے کو مارتے نہیں، مگر انسان جانور کی اولاد ہونے کے باوجود یہ سب کچھ کر رہا ہے۔''

اس بات کی تائید کرتے ہوئے لومڑی نے کہا کہ:

''انسان مکاری میں مجھ سے اوپر ہوگیا ہے۔ کاغذوں پر درخت اگانے کے فیصلے کرتا ہے، مگر حقیقت میں درخت اجاڑنے کے منصوبے بناتا ہے۔ امن کی بات کرتا ہے، مگر اندر ہی اندر جنگ کی تیاری کرتا ہے۔ زمین سے تمام دھاتیں لے کر اس کی کوکھ سونی کر چکا ہے۔'' اتنی دیر میں بلی نے کہا:

''زمین بہت پریشان ہے، اب یہ بولتی ہے سیلابوں کے ذریعہ، زلزلوں کے ذریعے۔'' سانپ نے اپنی بات کرتے ہوئے کہا:

''میرے تمام ڈنک بے کار ہوگئے ہیں اور میں اگر اب کسی کو ڈنک مارتا بھی ہوں تو اثر نہیں ہوتا۔ اب تو میرا ڈر بھی لوگوں میں ختم ہوگیا ہے، کیونکہ انسان بات کرتا ہے تو لگتا ہے ڈنک مار رہا ہے۔ دوست بن کر، اس کے گھر کے کونے میں چھپ کر اس کی لڑکیوں کی جوانی کو ڈسنے کی کوشش کرتا ہے۔ دولت اکٹھی کر کے میری طرح اس پر بیٹھ گیا ہے۔ کسی کو بھی وہ دولت استعمال نہیں کرنے دیتا۔ اب کہ ہی ہماری میٹنگ میں کہا گیا کہ وہ سانپ انسان کی طرح دولت پر بیٹھ گیا ہے۔''

میٹنگ بڑے اچھے طریقے سے چل رہی تھی، نہ کوئی ہنگامہ تھا اور نہ ہی ایک دوسرے کو کوئی گالی دے رہا تھا اور نہ ہی ایک جانور دوسرے جانور کو بولنے کے حق میں مداخلت کر رہا تھا۔ سانپ اور نیولا ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے اور بلی اور چوہا بھی ساتھ ساتھ۔ اتنی دیر میں کتے نے احتراماً کہا:

''کیا مجھے کچھ بولنے کا موقع ملے گا'' اس پر شیر نے کہا:

''چوہے کے بعد'' یہ الفاظ سنتے ہی چوہا کھڑا ہوگیا اور جانوروں سے خطاب کرنے لگا اس نے کہا:

''انسان کی وجہ سے ہماری نسل ہی ختم ہوجائے گی۔''

''وہ کیسے'' شیر نے چوہے سے وضاحت کرنے کو کہا۔

''وہ اس طریقے سے کہ ہم انسان کے گھر سے اناج کھاتے

ہیں، سبزیاں کھاتے ہیں، مگر وہاں تو ہر چیز ملاوٹی ہے اور ہمارے بچے چوہے کمزور پیدا ہو رہے ہیں اور ہمیں بھی کئی بیماریاں لگ رہی ہیں۔''

اس پر تمام بلیوں نے چوہوں کو عجیب انداز سے دیکھا مگر اچانک چیتے نے کہا:

''انسان کو معلوم نہیں ہے یہ ملاوٹ اس کے لئے بھی موت ہے۔'' ایک ہرن نے کہا:

''وہ سوچتا نہیں بلکہ کرتا ہے، اس کی لالچ و ہوس اتنی آگے بڑھ گئی ہے کہ اس میں سوچنے کی طاقت ہی نہ رہی، ورنہ کیا وہ سوچ نہیں سکتا کہ ایٹمی ہتھیار پوری دنیا کو تباہ کر دیں گے مگر اس کے باوجود ہتھیار بنا رہا ہے۔''

سارے جانور خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد کتے کو کہا گیا کہ اب وہ اپنی بات کہے۔ کتے نے اپنی تقریر شروع کرتے ہوئے کہا:

''میں سونگھنے کی طاقت رکھتا ہوں، اس لئے میں اپنے تجربے اور حالات کے مطابق وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اب کتوں کی نسل انسان کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں رہی ہے کیونکہ انسان تو انسانیت سے گر گیا ہے، مگر کتا کسی بھی لحاظ سے حیوانیت سے نہ گر سکتا ہے اور نہ ہی کسی بھی طریقے سے اپنی کتیت یعنی کہ وفاداری کو چھوڑ سکتا ہے۔ انسان اب معصوم لڑکیوں کو اپنی ہوس کا شکار بنا رہا ہے، مگر کتوں میں ایسا نہ ہے کیونکہ چھوٹی چھوٹی معصوم کتیوں کے ساتھ کوئی بڑا کتا غلط کرنے کے بارے میں سوچ نہیں سکتا ہے اور انسان نے جو سیاسی نظام بنایا ہے اس میں مجھے لگتا ہے کہ کتوں کی وفاداری بھی کمزور ہو جائے گی۔''

سب جانور کتے کی یہ بات سن کر اور یہ جان کر کہ انسان چھوٹی بچیوں کو اپنی ہوس کا شکار بنا رہا ہے۔ ایک دم نعرے لگانے لگے۔

''انسانیت مردہ باد، جانوریت زندہ باد۔''

پھر یہ نعرے اور زور سے لگے۔ انسانیت مردہ باد، جانوریت زندہ باد۔ ان نعروں کے ساتھ جلوس شروع ہو گیا اور آگے بڑھنے لگا۔ تمام جانور ایک ہی مانگ کر رہے تھے کہ انہیں ایک الگ صوبہ دیا جائے جہاں انسان نہ ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ جانوروں کے بچے انسانوں کے بچوں سے یہ سب کچھ سیکھ کر جانوریت کو ہی تباہ کر دیں اور پھر اس جلوس کے ساتھ یوں لگ رہا تھا جیسے درخت بھی چل رہے ہوں گویا کہ جانوروں کی تائید کر رہے ہوں۔ ❁❁

ہم نفس

(ص۵۱ سے آگے)

بس یاد رہ گئی تو وہ جہیز کی چھوٹی سی صندوقچی اور اس میں جمع شدہ کچھ پرانا ٹوٹا پھوٹا زیور۔ وہ بار بار یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ کب کب میں نے اسے اس جمع پونجی کے بارے میں بتانے کی کوشش کی تھی، مگر اس نے سنا نہیں تھا، پھر وہ مجھ سے محبت کے وہ سارے الفاظ کہتا ہے جو اب اپنی وقعت کھو چکے ہیں وہ روتا رہتا ہے اور پوچھتا رہتا ہے کہ اسے مجھ سے محبت کب ہوئی، اس نے کبھی مجھے سننا ہی نہیں چاہا اور وہ آج بھی نہیں سنتا، حالانکہ میں اسے بتاتی ہوں کہ میرے سوئم والے دن جب تمہیں الماری میں میرے جہیز کی صندوقچی ملی تھی تمہیں مجھ سے محبت ہو گئی تھی۔ ❁❁

غزل کی حمایت میں

یہ بات ہرگز صحیح نہیں کہ غزل میں مہذب و متمدن شاعری ہو ہی نہیں سکتی۔ غزل میں اگر عضویاتی تنظیم نہیں ہوتی تو اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ اشعار مفرد کی یکجا پیش کش قطعی غیر فنکارانہ ہے۔ اشعار مفرد میں بھی حسن کی جلوہ گری ہوتی ہے۔ وہ گاہے گاہے اچھی نظموں پر بھی بھاری ہوتے ہیں منظّم حسن کاری میں ایک خاص قسم کی لذت بخشی ملتی ہے، لیکن حسن کی انفرادی اداؤں میں بھی سامان لذت و نشاط ہے۔ ان لذتوں کو برے معنی میں نیم وحشت یابی نہیں کہہ سکتے۔ کیا وہ ہر میلان فطرت، ہر جبلت، ہر خصوصیت، جو دور وحشت یا عہد نیم وحشی کہا جاتا ہے، اس کے برخلاف، تصنع، دکھاوا، خود غرضی، دو دن کی پر بیت متمدن دور کی وبائیں ہیں اور ان کا سایہ ادب پر بھی پڑ رہا ہے۔ میں کہتا ہوں ہمارے سماج کے نیم وحشی دور کے بہت سے عناصر آج کی مہذب دنیا کے لئے بیتابانہ طور پر ضروری ہیں، اگر غزل کے فن میں ایسے ہی نیم وحشی عناصر ہیں تو وہ اس قابل ہیں کہ انہیں توازن حیات اور توازن فن برقرار رکھنے کے لئے قائم رکھا جائے۔

(اختر اورینوی کے مضمون "فن غزل" سے ماخوذ)

منظومات

الماس شمی
City- EL Paso, State, Taxes, USA

دیر سویر تو ہو جاتی ہے

دروازے پہ جو آنکھیں ہیں
اُن آنکھوں میں جو سپنے ہیں
اُن سپنوں میں جو مورت ہے
وہ میری ہے
دروازے کے باہر کیا ہے؟
اِک رستہ ہے
جس پر میری یادوں کا شہر بسا ہے
میرا رستہ دیکھنے والی اُن آنکھوں کا جال بچھا ہے
مجھے پتا ہے
لیکن اُن آنکھوں کو کیسے میں یہ بات بتاؤں
ہر رستے پہ اتنی بھیڑ کہ،
چلنا مشکل ہو جاتا ہے
آوازوں کے اس جنگل سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے
دکھ کا ایسا لمحہ آتا ہے ہنسنا مشکل ہو جاتا ہے
جب ایسے حالات کھڑے ہوں
قدموں میں زنجیر کی صورت
روشنیوں کے سائے پڑے ہوں
ایسے میں ان آنکھوں سے
ایک ہی بات کہے جاتا ہے
دیر سویر تو ہو جاتی ہے

❁❁❁

احساس

رات پلیٹ میں دُکھ رکھا تھا
صبح کے کپ میں بیزاری تھی
شام چائے کے ساتھ پڑا تھا
دل کی صورت والا برفی کا اِک ٹکڑا
آج میرے کمرے میں پھر سے ہجر کی ٹیبل پر
دل کا پیالہ یوں اشکوں سے بھرا ہوا تھا
اندر سے کچھ ٹوٹ گیا تھا
اور اِک جگ یادوں سے بھرا میری جانب دیکھ رہا تھا
ایک گلاس تھکن کا خالی
جیسے در سے کوئی سوالی
بن پائے ہی لوٹ گیا تھا
نیند کے تکیے پر سر رکھا
میرے سرہانے کتاب تمہاری
میرا جیون دم سادھے چپ چاپ پڑا تھا
میں نے جونہی ہاتھ بڑھایا
لفظوں سے اِک چہرہ اُبھرا
خواب کی چادر مجھے تھما کر مجھ سے بولا
رات بہت ہی بیت چکی ہے
اب سو جاؤ

❁❁❁

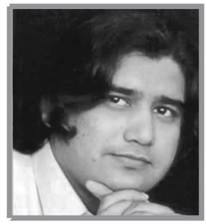

سید تحسین گیلانی

497, President Styen Street
Pretoria North,
Pretoria, South Africa

کیا غلط ہے..؟

میں اگر سورج پہن لوں
روشنی کی شال اوڑھوں
رات کا چہرہ ٹٹولوں
مست ہولوں
بے سبب ہی مسکرالوں
خواہشیں سولی چڑھا لوں
راستوں کو اپنے قدموں میں سمولوں
تھوڑا ہنس لوں، تھوڑا رولوں
اپنے اندر بہتے چشموں میں نہالوں
اپنی بے تابی کی میت کا
ذرا نوحہ میں کرلوں
دندناتی وحشیانہ رقص کرتی
اس ہوا کے ہونٹ چوموں
آج سجدوں میں اتر کر میں ابد کے قفل کھولوں
گنگ ہو کر بھی پکاروں اور بولوں
چشم دل کے آنسوؤں سے روح دھولوں
آج اگر میں گڑ گڑا لوں
......کیا غلط ہے؟
کیا غلط ہے......؟

❁❁❁

رئیس الدین رئیس

J-65, Safina Apartment,
Medical Road
Aligarh 202001

منزلوں کے خواب

کبھی دو سائے اک پیپل کے نیچے
دوپہر کی دھوپ سے بچنے کی خاطر
آ ملے تھے
دوپہر سے شام تک دونوں نے کچھ
وعدے کئے تھے
ساتھ جینے، ساتھ مرنے کی قسم لے کر
سفر میں چل پڑے تھے
چند لمحوں کے سفر کے بعد
پھر اک موڑ آیا
اور تا حد نظر
اک غبار مستقل تھا
وقت گزرا
رات ہر ساعت بکھرتی جا رہی تھی
چاند تارے
آسماں پر ٹمٹما کر
ظلمتوں میں کھو چکے تھے
صبح جب آئی تو سائے تنہا تنہا
یوں سفر میں تھے
کہ جیسے منزلوں کے خواب ٹوٹیں
ہجر کے لمحوں نے
آنکھیں کھول دی تھیں

❁❁❁

اسماعیل پرواز

242, Belilious Road, Howrah 711101

آزادی کا سکھ

گوریا نے بیا چڑیا سے کہا
گھونسلے میں رہ کر تم
بڑائی صنعت کی کرتی ہو
میں تو بڑی عمارت میں
سکھ سے رہتی ہوں
اور تم دھوپ، برسات
آندھی میں دکھ جھیلتی ہو
بیا چڑیا نے ہنس کر کہا
کیا تمہیں شک ہے؟
تکلیف بھی اٹھاتی ہوں
تو اپنے گھر میں رہتی ہوں
عمارت ہی کیوں نہ ہو
وہ دوسرے کا گھر ہے
اپنے ہاتھوں سے
بنایا ہوا
یہ کچا گھر ہی اچھا ہے

❁❁❁

(بنگلہ سے ترجمہ)

ایم۔نصر اللہ

Shalimar Apartment, 3, Satyen Bose Road
Danish Sk. Lane, Bakultala, Howrah 711109 (W.B.)

ملال

سنا ہے میں نے کہ تو خفا ہے
مری جدائی ستا رہی ہے
کہ تیری ممتا بلا رہی ہے
مگر ضرورت کی گہری کھائی
بھرے تو پہلے
کہ سلسلہ یہ رکے تو پہلے
بچھڑ کے تجھ سے تو آ گیا ہوں
جہانِ زریں کے سائباں میں
میں اپنی قسمت پہ شاد ماں ہوں
مگر جدائی کا غم مجھے بھی
ستا رہا ہے
رلا رہا ہے
خوشی کی چادر کے زیر سایہ بھی خوش کہاں ہوں
کہ تیری شفقت کے نرم آنچل سے
دور ہوں میں
امیر ہو کر غریب ہوں میں
کہ شہر زر میں ملول ہوں میں

❁❁❁

سلیم شہزاد

Shahzad Jewellers, Liaquat Bazaar, Quetta, Pakistan

برگد کچھ تو بول

اے بوڑھے برگد
پیار میں لپٹے ست رنگی دھاگوں والے
شفقت اور نروان کے پیکر
کتنے افسانے ہیں تجھ میں
چھال میں کتنے راز چھپے ہیں
صدیوں سے اک کرب میں لپٹی
رنگ برنگی شال کو اوڑھے
......ایک عجائب گھر جیسا ہے
برگد تو، کیا بن بیٹھا ہے؟
کہتے تھے مجھ سے یہ سارے
تو ہے اک آسیب سرائے
حیراں ہوں
مہتاب ہے کیسے؟
پریوں کو تو پاس بلائے
تو بچپن کا سنگی ساتھی
ہجر کی جلتی دوپہروں میں
میں نے بھی ارمان جلائے
......خواب سجائے
تیری چھاؤں میں چھن کر اترے تھے وہ خواب
خواب مرے انمول بہت تھے
میں اب رات کے سناٹے میں
خواب اپنے لینے آیا ہوں
تجھ کو تو معلوم ہے برگد
......کالی راتوں کی وحشت
ہجر کسی کا شدت سے جب
دل پر دیتا ہے دستک
کلی رات کے سناٹے میں
کیا ہم پہلی بار ملے ہیں
کیوں، تو ایسے گھور رہا ہے؟
تیری حیرت ٹھیک ہے، لیکن
میری اپنی ملکیت ہیں
گو آنکھیں شاداب نہیں ہیں
ہاں......! ان میں اب خواب نہیں ہیں
آنکھوں میں اب دھند ہے برگد
چہرے پہ بے خواب رتوں کی
میل جمی ہے، گرد اٹھی ہے
سنگ زنی ہے
اے برگد پہچان لے مجھ کو
میرے شانوں پر یہ بیٹھے
کالے کالے کاگ اڑا دے
اور میرے قدموں سے لپٹے
کالے کالے ناگ بھگا دے
کالی رات کے سناٹے میں
وحشت کا سامان نہ بن اب
......برگد یوں انجان نہ بن اب
......اے میرے سنگی برگد
کب سے میں اس بارِگراں کو
اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں
خواب مجھے اب واپس کردے
دیکھ خلاؤں کو پر کردے
آنکھیں ہوگئیں ہیں پتھر جیسی
آنکھوں میں اب دریا بھردے
اے برگد خاموش ہے کیوں تو؟
تجھ کو اچھے لگے ہیں کیا؟
خالی آنکھوں کے کشکول
برگد اپنے لب تو کھول
برگد مجھ سے کچھ تو بول
......برگد کچھ تو بول

اختر کاظمی

349, Arabpur, Near Basant Talkies, Fatehpur 212601 (U.P.)

آدمِ اصغر

باوا آدمؑ؟ یعنی پہلا آدمی!
یعنی ابوالبشر
آدمِ ثانی؟ یعنی کہ نوحؑ!
آدم اصغر؟
نوحؑ کی امت واُس کے بعد کے لوگ
فرمانِ واجب الاذّعان!
ہے تا ابد اِک سلسلہ انسانوں کا
ہاں مگر ان میں سے چند، ہوتے ہی آئے ہیں
آدمی کے خول میں حیوان کچھ
بے ادب، تہذیب سے نا آشنا
چشم بینا ہے تو ان کو دیکھئے
سابقہ وقتوں میں بھی تھے
نوحؑ کے طوفاں سے پہلے، بعد بھی
آج بھی ہیں، کل بھی ہوں گے
آیا تھا جب طوفانِ نوحؑ
ختم سارے ہو گئے تھے
رہ گئے تھے حق پرست
پھر سے پیدا ہو گئے کچھ نابکار
تا ابد باقی رہیں گے
جو بھی ہیں، جیسے بھی ہیں
آدمِ اصغر ہیں سب!

❁❁❁

ارشد قمر

Lal Kotha Road, Muslim Nagar, P.o. Daltonganj
Dist Palamu 822101 (Jharkhand)

عازمین حج کے نام

عازمین حج مبارک باد تم کو یہ سفر
ہم غریبوں کو بھی رکھنا تم ذرا پیش نظر
کس قدر پر کیف ہے منظر دیارِ پاک کا
ذرہ ذرہ نور ہے دیکھو وہاں کی خاک کا
خانہ کعبہ پہ جب پہلی نظر پڑ جائے گی
جو دعا مانگو گے وہ مقبولیت ہی پائے گی
ہو فریضہ جب سعی کا یا ہو کنکر مارنا
یا صفا مروہ میں ہو جب بھی ادب سے دوڑنا
جب مناسک پورے ہوں اعجاز کے انداز میں
فضل ربی تب ملے گا ہر نیاز و ناز میں
جب طوافِ خانۂ کعبہ مکمل کر لیا
دل میں ہو محسوس کہ اللہ راضی ہوگیا
سوئے طیبہ کا سفر بھی ہوگا یوں جاذب نظر
نور ونکہت میں ہے ڈوبی جس کی ہر شام وسحر
دل میں ہو عشق محمد اور زباں پہ ہو درود
رحمت و بخشش عطا ہو، خاک ہو نام ونمود
عرض کر دینا مرے آقا سے تم میرا سلام
حاضری دینے کی خاطر ہی تڑپتا ہے غلام
مجھ کو بھی مل جائے آقا باریابی کا شرف
بخش دیں مجھ کو بھی ایسی کامیابی کا شرف
ایک دن اذنِ حضوری آپ سے پائے قمر
کاش آجائے کبھی اس کی دعاؤں میں اثر

❁❁❁

غزلیں

پروفیسر مظفر حنفی
D-40, Batla House, Jamia Nagar
New Delhi 110025

میں کہ محو خواب تھا
شہر میں سیلاب تھا

ہم بھی چلتے ہی رہے
ہم سفر مہتاب تھا

ناؤ میں سوراخ تھے
سامنے گرداب تھا

سطح پر بہتے چراغ
پھول زیرِ آب تھا

ہم کہاں تھے دستیاب
تو اگر کمیاب تھا

میری خاموشی کے گرد
نرغۂ احباب تھا

❁❁❁

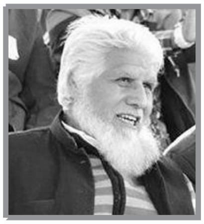

محمد یعقوب آسی
C/o Naveed Baloch,
Transport University of Engineering and Technology
Taxila 47050 (Pakistan)

شعلہ جاں کو کچھ ایسے بھی ہوا دیتے ہیں دوست
اپنی آہیں میرے اشکوں میں ملا دیتے ہیں دوست

اعتماد اپنے لکھے پر کچھ مجھے یوں بھی ہوا
پڑھتے پڑھتے بھول جاتا ہوں، بتا دیتے ہیں دوست

چہرہ خوانی کا ہنر کتنا اذیت ناک ہے
برہمی ماتھے پہ ہوتی ہے، دعا دیتے ہیں دوست

محو حیرت ہوں کہ مجھ سے کیا کچھ ایسا ہوگیا
طعنہ و دشنام کیا کیا برملا دیتے ہیں دوست

تم بھلے کچھ بھی کہو آسی مگر اک بات ہے
آدمی کو زندگی کرنا سکھا دیتے ہیں دوست

❁❁❁

غزلیں

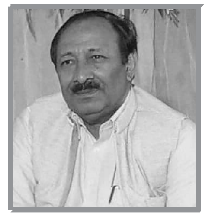

ڈاکٹر نثار احمد

Doctor's House 54/2-L Okara, Punjab, Pakistan 56300

سیم و زر کے بت کو ہوتے دیکھتا ہوں پاش پاش
اے مری درماندگی اب تو ذرا ہشیار باش

عین ممکن ہے کسی دن توڑ دے زنجیر بھی
بے بسی کے پاؤں میں ہونے لگا ہے ارتعاش

بچپنے کے ساتھ ہی مجھ پہ بڑھاپا آ گیا
کھا گیا میری جوانی کو مرا فکر معاش

پھر کسی کن کی ضرورت ہے خدایا اب یہاں
زندگی کو زندگی کی آج بھی تو ہے تلاش

انسانیت کی موت کو تو ایک مدت ہوگئی
اب اٹھائے پھر رہے لوگ اپنی اپنی لاش

کھیل بن کے رہ گئی ہے ہم غریبوں کی حیات
مختلف ہاتھوں میں جیسے بٹ رہی ہو کوئی تاش

اور بھی تو ہے بہت کچھ درمیان ہست و بود
تیری پردہ داریوں کے ہو نہ جائیں راز فاش

درد دل، سوز جگر ، ضعف بصارت ، گٹھیا
شہر جاں میں آبسے ہیں کیسے کیسے بدقماش

بے وفا کا نام کیا لوں اب تو خواہش ہے نثارؔ
وہ مجھے بھولا ہوا ہے ، بھول جاؤں میں بھی کاش

❁❁❁

تسلیم الٰہی زلفیؔ

142, Oxford Street, Richmond Hill, Ontario
L4C, 4L7, Canada

یہ بھی ممکن ہے کہ ، قسمت کا اشارہ ہوجائے
جو کسی اور کا ہے ، اب وہ ہمارا ہوجائے

وہ مجھے نہ بھی ملے ، پر مرے امکاں میں رہے
صرف اتنا ہو کہ جینے کا سہارا ہوجائے

مدتیں ہوگئیں سینے سے لگائے اس کو
مدد اے شوق! کہ یہ کام ہمارا ہوجائے

قدر کم اس کی نہ ہوجائے مری نظروں میں
یہ نہ ہو ، مجھ کو محبت میں خسارہ ہوجائے

پیار مانگا نہیں ہم نے کبھی ، حد سے بڑھ کے
اتنا مل جائے کہ بس اپنا گزارہ ہوجائے

جس کو ہم مل گئے ، یہ اس کا مقدر زلفیؔ
اپنی قسمت میں کہاں وہ ، جو ہمارا ہوجائے

❁❁❁

غزلیں

فرحت ندیم ہمایوں

2814 West 19th Street, Brooklyn, New York 11224

ہر ایک شخص کی جاگیر تھوڑی ہوتا ہے
یہ دل ہے اس طرح تعمیر تھوڑی ہوتا ہے

یہ وہ نشہ ہے جو دیتا ہے صرف سرشاری
جو عشق کرتا ہے دل گیر تھوڑی ہوتا ہے

نکل کے اس کی کماں سے جو آئے میری طرف
کچھ اور ہوتا ہے وہ تیر تھوڑی ہوتا ہے

بس اس کے کہنے پہ رکنے لگے قدم میرے
ہر ایک پاؤں کی زنجیر تھوڑی ہوتا ہے

دکھائی دیتے ہیں جس میں وصال کے منظر
وہ خواب حاصل تعبیر تھوڑی ہوتا ہے

بتاؤ قافیہ پیمائی کرنے والوں کو
یہ کام کرکے کوئی میؔر تھوڑی ہوتا ہے

ہو خوش نصیب جو بخشا ہے عشق نے تمہیں غم
یہ غم ہر ایک کی تقدیر تھوڑی ہوتا ہے

حبیب الرحمٰن مشتاقؔ

Senior Officer, Zarai Taraqiati Bank Ltd. (ZTBL)
Zonal Computer Centre, Zonal Office
Saddar Bazar, Gilgit, Pakistan, Postal Code 15100

چھیڑ لیتے ہیں مجھے اب بھی ترے نام سے لوگ
آتے جاتے ہیں مرے پاس اسی کام سے لوگ

تیری دہلیز پہ بیٹھے ہیں لئے چشم حریص
خاص بننے کی تمنا میں یہی عام سے لوگ

سازشیں بنتے ہوئے رات بتا دیتے ہیں
سو نہیں سکتے مرے شہر میں آرام سے لوگ

سب نے دیکھا ہے بکھرتے ہوئے شیرازۂ عشق
کیوں پکڑتے نہیں عبرت مرے انجام سے لوگ

تم نے آنا ہے سر بامِ محل پچھلی رات
آئینے چاٹنے بیٹھے ہیں مگر شام سے لوگ

قیس و فرہاد و پنوں ، و امق و رانجھا سارے
ہیں مرے عشق کی تاریخ میں گمنام سے لوگ

ہے مفر کس کو ترے کن سے اے صیاد فلک
بچنا چاہیں بھی نہ بچ پائیں ترے دام سے لوگ

اپنی آنکھوں میں لئے ماں کی دعاؤں کے چراغ
پڑھنے آتے ہیں مرے شہر میں ہر گام سے لوگ

غزلیں

مہؔرافروز
3rd Phase, K.H.B. Colony, D.N. Coop,
Dharwar, Karnatak 580008

جنونِ عشق حد سے بڑھ گیا ہے
ترا گھر اور مرا بھی گڑھ گیا ہے
نشاں سجدے کا دہشت کی علامت
یہ تہمت بھی مرے سر مڑھ گیا ہے
ذرا آئینے رکھ دو بالمقابل
جنونِ خود پرستی بڑھ گیا ہے
شفق کا رنگ کیوں ہے لال سارا
لہو کس کا فلک پر چڑھ گیا ہے
مرے سچ کی گواہی کون دے گا
یہاں انصاف سولی چڑھ گیا ہے
یہ دریا کی جسارت توبہ توبہ
کناروں سے بھی آگے بڑھ گیا ہے
مکافاتی صدا سن لے زمانے
سوا نیزے پہ سورج چڑھ گیا ہے
دھاون کی ردا کوئی اوڑھا دو
خمار اب مہؔر کا بھی بڑھ گیا ہے

❀❀❀

علی قسوؔر خلیق
Ali Qaswar Khaleeq
House # 81, Street # 42, G- 10/4
Islamabad, Pakistan

مدتوں دل پہ یہی نقش جراحت ٹھہرا
میرا اور اس کا تعلق کوئی مدت ٹھہرا
چند تصویریں ہیں اور ایک ملاقات کی یاد
اسی دولت پہ تو میں صاحب ثروت ٹھہرا
تو نے جو دل میں کسی اور کو ٹھہرایا ہے
ایسا کرنا تو امانت میں خیانت ٹھہرا
کتنا کم ظرف ہے دیکھو یہ زمانہ ، جس میں
سرکشی کرنا رواجوں سے بغاوت ٹھہرا
کیا سے کیا ہو گئے مفہوم رویوں کے آج
میرے کردار کا ایک نقص شرافت ٹھہرا
ایک دنیا کو لئے پھرتے تھے ہمراہ مگر
حاصل زیست فقط ایک رفاقت ٹھہرا
ٹھہر کر رہ گئیں پھر وقت کی نبضیں یک دم
گرچہ محفل میں وہ بس ایک دو ساعت ٹھہرا
خود کو یہ خود کا بھی رہنے نہیں دیتا صاحب
کتنا بے کار سا یہ کام محبت ٹھہرا
دشت آواز دیئے جاتا ہے مجھ کو قسوؔر
قیس ہر دور میں صحرا کی ضرورت ٹھہرا

❀❀❀

غزلیں

عرشؔ صہبائی

53, Resham Ghar Colony, Jammu 180016 (J&K)

کسی طرح بھی تذبذب سے ہم کنار نہیں
جو زندگی میں کسی وہم کا شکار نہیں

جہاں خلوص و محبت کی جوئبار نہیں
وہ زندگی کسی صورت بھی باوقار نہیں

عجیب صورتِ حالات میں ہوں میں زندہ
ہزار غم ہیں ، مگر کوئی غم گسار نہیں

اڑا سکے گی نہ مجھ کو ہوا زمانے کی
یقین کیجئے ، میں راہ کا غبار نہیں

یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں سب ہیں الجھے ہوئے
نہیں ہے کوئی جسے فکر روزگار نہیں

عروس زندگی کی اور کیا کروں تعریف
کوئی ادا نہیں ایسی جو شاہکار نہیں

مری حیات میں ایسا نہیں کوئی لمحہ
کہ جب مرا دلِ حساس نغمہ بار نہیں

کس کے آنے کی آہٹ پہ ہے نظر میری
کہوں میں کس طرح میں محو انتظار نہیں

❀❀❀

اشرفؔ یعقوبی

6/2/H/1, K.B.IST Lane, Narkul Danga,
Kolkata 700011

مجھے معلوم ہے کس در پہ کیا کرنا ضروری ہے
کہاں دل کو جھکانا ہے ، کہاں سجدہ ضروری ہے

ہے ذمہ داری موسم کی نہ اس کو بانجھ رہنے دے
جوانی پیڑ پر آئی ہے تو پھلنا ضروری ہے

یہ ہے توہین الفت جسم پاکیزہ سے مت کھیلو
محبت ہے تو اس کی روح سے رشتہ ضروری ہے

تہہ دل سے کرو تعظیم اس کی ہے بجا لیکن
امیر شہر کا کیا چاٹنا تلوا ضروری ہے

اگر سچ سانولا ہے جھوٹ کا غازہ لگا لینا
دوائے تلخ میں تھوڑا بہت میٹھا ضروری ہے

بدن سونے کا لے کر آپ آئے ہیں کہاں اشرفؔ
یہ بازارِ محبت ہے یہاں گھاٹا ضروری ہے

❀❀❀

غزلیں

شاہد اختؔر
Gaya College Gaya 823001

سفر کیسا کہ امکان سفر قائم نہیں رہتا
کوئی منظر مرے پیش نظر قائم نہیں رہتا

گمان عظمت فتح و ظفر قائم نہیں رہتا
چھتیں مسمار ہوجاتی ہیں در قائم نہیں رہتا

امید صبح جو مجھ کو ترو تازہ نہیں رکھتی
میں اتنی شام کے زیر اثر قائم نہیں رہتا

کسی کو نیند تو آتی نہیں ہے ہجر میں پھر بھی
کسی کے جاگتے رہنے کا ڈر قائم نہیں رہتا

کہیں کچھ بھی نہیں اب خاک سی اڑتی ہے آنکھوں میں
چمن میں گل سمندر میں گہر قائم نہیں رہتا

میں خود بھی آئینے میں عکس لایعنی کا کہرا ہوں
یہاں کوئی بھی نقش معتبر قائم نہیں رہتا

دلوں میں خواہشوں کی اب کوئی شمع نہیں جلتی
لہو میں رقص طاؤس ہنر قائم نہیں رہتا

کہیں بھی جذبۂ ایثار کا موسم نہیں اختؔر
کسی شاخِ شجر پہ ثمر قائم نہیں رہتا

ظفؔر صدیقی
Phulwari Sharif, Patna

فکر دنیا سے الگ گوشہ نشیں رہتے ہیں ہم
جس جگہ کوئی نہیں رہتا وہیں رہتے ہیں ہم

بدگمانی ہوگئی ہے دو دلوں کے درمیاں
وہ کہیں رہنے لگے ہیں اور کہیں رہتے ہیں ہم

اپنی قسمت میں خدا نے دشمنی لکھی نہیں
دوستی کرنے کو بالائے زمیں رہتے ہیں ہم

جسم و جاں کو سردیوں کی دھوپ لگتی ہے بھلی
دن نکل آئے تو کمرے میں نہیں رہتے ہیں ہم

جگنوؤں جیسے نظر آتے ہیں سب جلتے چراغ
جب شریک محفل زہرہ جبیں رہتے ہیں ہم

نکتہ چینی کرنے والے دل کو پہنچاتے ہیں چوٹ
کیا برا ہے جو خلاف نکتہ چیں رہتے ہیں ہم

جس کو شہرت سے نوازا ، اس سے رسوائی ملی
اس رویے پر بہت ہی شرمگیں رہتے ہیں ہم

موت آنے پر کہاں رہتا ہے کوئی اختیار
زندگی میں صاحب دنیا و دیں رہتے ہیں ہم

جس کو کہتے ہیں ظفؔر سب لوگ ''پھلواری شریف''
اس زمیں پر صورت عرش بریں رہتے ہیں ہم

کتابوں کی دنیا

نام کتاب	:	دہلی کے ۵۰ صحافی
مصنف	:	ظفر انور
ناشر	:	مصنف کتاب ظفر انور
اشاعت	:	جنوری ۲۰۱۵ء
صفحات	:	۲۷۲
قیمت	:	۱۳۹ روپے
مبصر	:	**ڈاکٹر شائستہ انجم نوری**

اردو مطبوعات کا سلسلہ ہمیشہ سے اس بات کی طرف اشارہ کرتا رہا ہے کہ یہ زبان علمی سے کہیں زیادہ ادبی وشعری زبان ہے اور اس سے یکسر انکار کی گنجائش نہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو میں متنوع علمی موضوعات پر معیاری کتابیں اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور باذوق قارئین تک پہونچتی رہتی ہیں۔ ظفر انور کی زیر نظر تصنیف ''دہلی کے ۵۰ صحافی'' بھی اسی زمرے میں داخل ہے۔

اردو میں صحافت کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابیں عموماً سہ گانہ نوعیت رکھتی ہیں۔ بعض کتابیں خالص تکنیکی اور فنی مباحث سے آراستہ ہیں، بعض کا تعلق اردو صحافت کی ارتقائی تاریخ سے ہے اور بعض کتابوں میں مختلف انداز سے اردو صحافیوں کے احوال وآثار یکجا کئے گئے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اس نوعیت کا کام شروع ہوا اور پھر آہستہ روی کے ساتھ سہی، مگر یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔

زیر نظر سوانحی کتاب بھی دراصل اسی سلسلے کی ایک خوبصورت کڑی ہے۔ کتاب کا سرورق رنگین وحسین ہی نہیں بامعنی بھی ہے۔ مصنف نے اپنی اس کاوش کا انتساب مولانا سید ارشد مدنی کے نام کیا ہے اور ان کی ایسی مساعی جمیلہ کو وجہ انتساب بنایا ہے جن سے بالواسطہ طور پر عصری تناظر میں صحافت کی ذمہ داریوں کی طرف اشارہ ہو جاتا ہے اور ایک خاموش عملی وفکری پیغام ملتا ہے۔

صحافت جناب ظفر انور کا خاص موضوع ہے۔ اس سے پہلے ان کی کتاب ''دہلی کے اردو صحافی: آزادی کے بعد'' ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئی تھی جس میں ۲۸ رفتگان اور ۲۲ قائمان کا تذکرہ ہے اور اب ان کی دوسری کتاب منظر عام پر آئی ہے، جس میں ۴۱ قائمان اور ۹ رفتگان کو یاد کیا گیا ہے۔ پیش نظر کتاب کے تقریظ نگار ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے درست لکھا ہے کہ:

> ''جب کبھی دلی کی اردو صحافت یا برصغیر کی اردو صحافت کی تاریخ مرتب ہوگی تو صحافت کا مورخ ظفر انور کی کتابوں سے ضرور استفادہ کرے گا۔'' (ص ۱۳)

اوراق تقریظ کے بعد، ظفر انور سے بات چیت پر مبنی جناب ''اشہر ہاشمی کی صاف صاف، کھری کھری'' باتیں سامنے آتی ہیں اور ان میں بلاشبہ عصری صحافت کی فکری وعملی اور اصلاحی ذہن سازی کے لئے خاصا مواد موجود ہے۔ ڈاکٹر عبدالواسع کا مضمون ''ظفر انور: ایک تعارف'' بھی نہایت جامع اور معلوماتی ہے۔ انہوں نے ظفر انور کو ایک ''کہنہ مشق اور تجربہ کار'' صحافی بتاتے ہوئے، ان کی اداریہ نویسی کے فکری وادبی محاسن کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''انہوں نے صحافیوں کے حالات وکوائف پر لکھتے وقت نہایت حزم واحتیاط سے کام لیا ہے، انہوں نے اپنی تحریر کو جانبدارانہ روش کی آلودگیوں سے یکسر پاک رکھا ہے۔ ان کی نگارشات میں عدالت وانصاف کا حسین توازن دیکھنے کو ملتا ہے۔ انہوں نے سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ لکھا ہے اور ایک آئینے کی طرح جیسا ہے ویسا دکھانے کی کوشش کی ہے۔'' (ص ۲۱)

یہ کہنا شاید غلط نہیں کہ زیر نظر کتاب کے آئندہ اوراق مذکورہ خیال کی

بیش از بیش تصدیق کردیتے ہیں۔

اس کتاب میں ''دہلی کے صحافی'' سے مراد وہ حضرات نہیں، جن کا وطن مالوف دہلی ہے بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی صحافتی خدمات کا عملی ونمایاں مرکز ومحور دہلی رہا اور آج بھی دہلی ہی ہے۔ یہ کتاب ''خراج تحسین'' اور ''خراج عقیدت'' کے عنوان سے دوحصوں میں منقسم ہے ''خراج تحسین'' کے تحت ابرار رحمانی، اشہر ہاشمی، افسر جعفری، انیس اعظمی، انیس مرزا، انیس امروہوی، انیس درانی، اے۔این۔شبلی، اے یو آصف، بسمل عارفی، جاوید قمر، حقانی القاسمی، خرم قیومی، خواجہ محمد اکرام الدین، رؤف رامش، رئیس صدیقی، ریاض قدوائی، سلیم

شیرازی، سید فیصل علی، سید منصور آغا، شاہد الاسلام، شاہد پرویز، شکیل احمد رحمانی، شکیلہ اختر، شکیل شمسی، شمع افروز زیدی، ضیاء الرحمٰن غوثی، عبدالواسع، عتیق الرحمٰن، عطا عابدی، عقیدت اللہ قاسمی، ڈاکٹر فیروز دہلوی، قاری محمد میاں مظہری، کلدیپ نیر، لطیف کرمانی، محمد عارف اقبال، معصوم مرادآبادی، نصرت ظہیر، نند کشور وکرم، محمد وسیم الحق اور یاس دہلوی کو اور ''خراج عقیدت'' کے تحت مولانا امداد صابری، خشونت سنگھ، ڈاکٹر ستیہ وادی، سعید خاں، سید عبدالباری، مولانا سلیمان ندوی، مولانا عبدالحمید رحمانی، عتیق صدیقی اور عشرت علی صدیقی کو یاد کیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات بہت اچھی اور سہولت بخش ہے کہ مشمولہ شخصیات کو ترتیب میں حروف تہجی کے اعتبار سے رکھا گیا ہے اور ان کی خدمات، اسلوب تحریر اور شخصی اوصاف وشمائل کا نہایت متوازن علمی انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

مصنف نے عموماً یہ سعی کی ہے کہ مشمولہ صحافیوں کی تاریخ ولادت، ان کے وطن، شخصی کوائف، دیگر اعلیٰ مناصب، کالم نگاری، اداریہ نویسی، مختلف النوع تکنیکی مہارت اور مزید برآں بحیثیت منتظم، ادیب وناقد اور شاعر، ان کی شہرت ومقبولیت کا کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے۔ یہاں صحافیوں کے افکار، ان کی دوراندیشی ودیدہ وری، زبان وبیان پر ان کی گرفت، سیاسی وسماجی وقوعات میں ان کے صحافتی تجزیوں کے اثرات، پرنٹ میڈیا کے علاوہ نشریات میں ان کے کارنامے، ان کے ساتھ پیش آنے والے بعض دلچسپ واقعات اور ان کی تحریروں کے اقتباسات کی پیش کش کا جس طرح اہتمام رکھا گیا ہے، وہ یقیناً لائق مطالعہ بھی ہے اور مفید مطلب بھی۔ بیشک یہ کتاب دستاویزی نوعیت رکھتی ہے۔

جناب ظفر جانتے ہیں کہ گھر والوں سے محصلہ معلومات بہت ہی خاص ہوتی ہیں اور اسی اصول پر انہوں نے اخباری عملوں اور خصوصاً کاتبین حضرات کے بیانات سے بخوبی استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب میں غیر مسلم صحافیوں اور خاتون صحافیوں کو بھی جگہ ملی ہے۔

زیر نظر کتاب کے بالاستیعاب مطالعہ سے بالواسطہ طور پر دو اور قابل ذکر تاثر بھی ابھرتا ہے، ایک تو یہ کہ آج کی صحافت، روزنامہ نگاری اور نشریات میں، دیگر تعلیمی اداروں کی سند رکھنے والوں کے علاوہ فارغین مدرسہ کی بہترین صلاحیتوں سے مستفید ہو رہی ہے اور دوسری بات یہ کہ دہلی کے موجودہ مایہ ناز صحافیوں میں بڑی تعداد ایسے فن کاروں کی ہے جن کا وطنی، تعلیمی اور تجرباتی رشتہ بہار سے ہے اور یقیناً یہ امر باعث فخر ہے کہ یہاں کے بالغ نظر اور محنتی ارباب فن، ملک کی راجدھانی میں اردو صحافت اور نشریات کو اپنی صلاحیتوں سے نواز رہے ہیں اور تازہ شناخت دے رہے ہیں۔ کتاب کے آخر میں آزادی کے بعد ''دہلی میں غیر مسلم صحافی'' کے نام مع اخبارات ورسائل دیے گئے ہیں جن کی تعداد ۵۳ تک پہونچتی ہے اور یہ بھی یقیناً ایک کارآمد فہرست ہے۔

بحیثیت مجموعی مشمولہ تذکروں کی جامعیت اور اس کے لئے مصنف کی محنت سے انکار ممکن نہیں، بس کہیں کہیں کچھ سوانحی تفصیل کی یک گونہ کمی، تشنگی کا احساس دلاتی ہے۔ اگر صحافیوں کے تذکرے کے ساتھ، نام بنام ان کی تصویریں شامل کردی جاتیں تو کتاب کی دستاویزی وقعت مزید بڑھ جاتی۔ بہرکیف، جناب ظفر انور کی یہ تصنیف اس قابل ہے کہ ارباب ذوق کے مطالعہ میں آئے اور علمی کتب خانوں میں جگہ پائے۔

نام کتاب	:	تحفۂ پاکیزہ
مصنف	:	صبا نقوی
ناشر	:	صبا نقوی، مصنف کتاب
اشاعت	:	۲۰۱۵ء
صفحات	:	۱۱۲
قیمت	:	۱۵۰
مبصر	:	**محمد شوکت جمال**

ادب اطفال کی اہمیت وافادیت اوراس کی ضرورت سے ایک زمانہ واقف بھی ہے اور اس کا قائل بھی، بلاشبہ بچوں کے لئے لکھی گئی کتابیں ان کی ذہنی واخلاقی تربیت کا بہترین ذریعہ بنتی ہیں اور ان میں کتب بینی کا وہ ذوق پیدا کرتی ہیں جو تاحیات ان کے کام آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر زبانوں کی طرح، اردو میں بھی بچوں کے لئے کتب ورسائل کی اشاعت کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری وساری ہے اور پیش نظر کتاب ''تحفۂ پاکیزہ'' بھی اس سلسلے کی ایک خوبصورت کڑی کا درجہ رکھتی ہے۔ جیسا کہ سرورق کی عبارت سے ہی ظاہر ہے، صبا نقوی کی نظموں کا یہ مجموعہ ''آٹھ سال سے اسی سال تک کے بچوں کے لئے'' ہے اور اسے مصنف نے اس امید کے ساتھ منظر عام پر لایا ہے کہ اس مجموعے کی ''نظمیں ندرت فکر اور لطافت احساس کی بنا پر بچوں کے ساتھ ساتھ بزرگوں کے لئے بھی دماغی سکون اور دلی طمانیت کا باعث قرار پائیں گی۔'' انہوں نے اپنے ''عرض حال'' میں بہار اردو اکادمی کے مجلّہ ''زبان و ادب'' کے مستقل گوشہ ''بچوں کا زبان وادب'' کو ایک ''تحریک'' کے مصداق قرار دیا ہے اور بچوں کے لئے ''انقلاب'' پٹنہ کے خصوصی صفحہ ''نئے ستارے'' کو بھی نہایت کارآمد بتایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادب اطفال کے فروغ میں صحافتی تعاون کی اہمیت و ضرورت کا احساس وشعور رکھنے والے ایک بالغ نظر فنکار ہیں۔

زیر نظر کتاب پر ''تحفۂ پاکیزہ اور صبا نقوی'' کے عنوان سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے پروفیسر نجم الہدیٰ نے شاید غلط نہیں لکھا ہے کہ:

''صبا صاحب نے بچوں کے لئے یہ نظمیں صرف اپنی قادرالکلامی کا سکہ بٹھانے کے لئے نہیں تخلیق کی ہیں بلکہ ان کے نزدیک نئی نسل کی ذہنی تربیت کا وہ نصب العین ہے جس نے ہمارے اکابر اور پیش رووں سے بھی اس سمت میں بڑے بڑے کام لئے ہیں......اس مجموعہ کلام میں اسلامی عقائد وعمل کا غالباً کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہو......صبا نقوی جہاں بچوں کے لئے ہلکے پھلکے الفاظ استعمال کرتے ہیں، وہیں عربی وفارسی کے الفاظ استعمال کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔''

صبا نقوی کا زیر نظر مجموعہ اکسٹھ نظموں پر مشتمل ہے اور یہ اچھی بات ہے کہ

فہرست میں نظموں کا سال تخلیق بھی دے دیا گیا ہے اور مطبوعہ نظموں کے ساتھ ان کے مقام اشاعت کی تفصیل بھی لکھ دی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ میں ۱۹۶۴ء سے ۲۰۱۴ء تک کی نظمیں شامل ہیں اور ان میں سے متعدد نظمیں موقر جرائد میں جگہ پا چکی ہیں۔ اس مجموعے میں شامل ''ماں''، ''وقت''، ''مشورہ''، ''اردو زبان کا ابجدی قاعدہ'' اور ''اچھے بچوں کا ترانہ'' جیسی نظمیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ بطور مثال نظم ''وقت'' کا یہ شعر دیکھئے ؎

وقت سے اپنے کھیلنے والا
نٹ کھٹ ہے، شیطان ہے پیارے

زیر نظر مجموعہ کی حمدیہ ودعائیہ نظمیں بھی نہایت پراثر، سادہ سلیس اور سہل ممتنع کی شان سے آراستہ ہیں۔ شاعر نے کہیں کہیں ؎

فقیری میں کماؤں
ثواب بادشاہی

جیسی بات کہہ کر حسن خیال اور حسن بیان کا بھی عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ علاوہ ازیں ''تحفۂ پاکیزہ'' کی نظموں میں جابجا ایسے مصرعے بھی متوجہ کر لیتے ہیں جو قول فیصل کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً ع

''ذکر نبی خدا کی عبادت سے کم نہیں''

''انسانیت کے درد کا درماں ہے کربلا''

''خیر کا جذبہ کام میں لائیں''

''حوصلوں کے پھول مرجھاتے نہیں''

اور

''صبر کا دامن ہاتھ میں رکھو''

اگر چہ زیر نظر مجموعہ کی اشاعت کا محرک نیک و صالح جذبہ ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اس میں بہت ساری ضروری باتوں کی طرف توجہ نہیں دی جاسکی ہے۔ مذہبی نظموں میں بسا اوقات اعتقادیات کے بیان کا غلبہ، انہیں بچوں کی نفسیات سے قرار واقعی انداز میں رشتہ مند نہیں ہونے دیتا ہے۔ بعض چیزیں قافلہ سحر کے نغمات کا انداز رکھتی ہیں ''اردو'' جیسی نظم میں طویل ردیف ملتی ہے تو ''تعلیم'' اور ''قلم'' جیسی نظم صریحاً بڑوں کے لئے ہے۔ عموماً مذہبی نظموں میں اسلامی ارکان کے دنیوی فوائد کا ذکر بہت کم ہوسکا ہے۔ نظم ''لیلۃ القدر'' میں ''خیر من الف شھر الخ'' کا مضمون نہیں آسکا ہے، ایک ایک موضوع پر کئی کئی نظمیں ہیں، مگر ان میں بچوں کے تعلق سے بہت کم باتیں ہیں، یہاں تک کہ نظم ''عید'' میں بھی بچوں کے لئے براہ راست کچھ نہیں۔ نظم ''فرزندان رسول'' میں ''دونوں'' سے جو ذات مقدس مراد ہے، اس کا نام آنا چاہئے تھا، مگر حضرات حسنینؓ کا نام کہیں نہیں آسکا ہے۔

جہاں تک زبان کے استعمال کی بات ہے، اس کے مزاج کا اندازہ تو کتاب کے نام ہی سے ہوجاتا ہے جو فارسی ترکیب کا حامل ہے۔ شاعر نے اضافت، در اضافت، ''مہبط لطف و کرم'' جیسی گاڑھی فارسی ترکیب اور یہاں تک کہ خمریاتی الفاظ کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا ہے اور بچوں کی نفسیات اور ان کے مبلغ علم کو بھلا دیا ہے۔

کتاب میں جابجا نثری فیلرز دئے گئے ہیں اور ان کی افادیت سے انکار بھی نہیں، مگر کیا اچھا ہوتا کہ یہ فیلرز بچوں کے تعلق سے خاص ناصحانہ اور معلوماتی ہوتے۔ ص۱۰۹ پر فیلر میں ''مولوی عبدالحق، بابائے اردو، کی پہچان ہیں'' معریٰ عن المعنی جملہ کے مصداق ہے۔ کتاب کا سرورق بیشک تاروں سے سجا ہے، مگر متن کی صحت جابجا اغلاط کی زد میں آگئی ہے جیسے ''تھفہ'' ص۶ ''حیقت'' ص۹ ''زیروز برتعلیم'' ص۸۴ بجائے ''......تعلیم کا'' پھر یہ کہ متن کو لائق خواندگی بنانے کی سہولت پر بھی توجہ کی کمی محسوس ہوتی ہے جیسے ''ر دا'' یعنی حرف کے درمیان فاصلہ، جابجا لفظوں پر اعراب کے اہتمام، فونٹ کی تبدیلی اور ازیں قبیل دیگر باتوں سے بھی حسن و نفاست اور صحت پر فرق آیا ہے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ، مگر بحیثیت مجموعی کتاب کی افادیت مسلم ہے اور اس کی اشاعت کے پس پردہ جذبہ خیر کی قدر ہونی ہی چاہئے۔ خدا کرے یہ کتاب بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبولیت پائے۔ ❀

یک بوسہ شیریں (ص۴۸ سے آگے)

اور لطیف حصہ، اس کے ساتھ تم مرد لوگ کیا سلوک کرتے ہو؟ کیا یہ ساری حسین، نازک اور لطیف اشیاء اتنے ظالمانہ سلوک کی حقدار ہیں؟ یہ سب سوال تمہارے قائم کردہ ہیں نا؟''

''ہاں ......'' اس نے پھر اقرار کیا۔ ''تم ہی کہا کرتی تھیں، تشدد کے اندر سے حظ کشید کرو۔ ہر چیز سے لطف اٹھاؤ۔ تم خود تو جو بھی ہو جیسی ہو، ٹھیک ہو، مگر مجھے تو ایسا نہ بناتیں تمہیں معلوم بھی تھا میرا فیلڈ اور ہے، میرے مسائل اور ہیں۔''

''ہوا کیا ہے؟ عمر افتخار تم اس طرح کی باتیں کیوں کر رہے ہو۔'' وہ پریشان ہوگئی۔ ''اس لئے بتا رہا ہوں کہ آئندہ تم کسی اور کو اس کے فریم سے باہر نکالنے کے جرم کا ارتکاب نہ کرنا۔ تم نہیں جانتیں میں نے آج تشدد کر کے ایک مجرم کو Expire کر دیا ہے اور اب 302 کے کیس میں جیل جانے والا ہوں۔''

یونٹ کے لوگ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے گوتم بدھ کے مجسمے کے پاس آئے تو وہ گوتم بدھ کے بازوؤں میں گری پڑی تھی۔ قریب ہی اس کے بائیں ہاتھ کے نیچے اس کا موبائل فون بکھرا پڑا تھا۔

❀❀❀

خبریں

بہاراردو اکادمی: نئی مجلس عاملہ کی تشکیل

پٹنہ: گزشتہ دنوں حکومت بہار کے اعلانیہ کے بموجب بہاراردو اکادمی کی نئی مجلس عاملہ کی تشکیل عمل میں آئی اور بحیثیت سکریٹری مشہورافسانہ نگار اورانتظامیہ کے ماہر جناب مشتاق احمد نوری نے اپنا منصب سنبھالا۔ اس نوتشکیل کمیٹی میں معروف شاعر جناب سلطان اختر کوکل وقتی نائب صدراور معروف ادیب وناقد ڈاکٹر اعجازعلی ارشد کو جز وقتی نائب صدر بنایا گیا ہے۔ مجلس عاملہ کے ممبران میں جناب علیم اللہ حالی، ڈاکٹر سید احمد قادری، پروفیسر ظفر کمالی، ڈاکٹر اقبال اختر، ڈاکٹر عابد نقوی اور ڈاکٹر زرنگار یاسمین کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ بہار کی سبھی یونیورسیٹی کے صدر شعبہ اردو بھی مجلس عاملہ کے رکن ہوتے ہیں۔ نئی مجلس عاملہ کی تشکیل کے اعلان کے ساتھ ہی اردو آبادی میں خاص جوش وخروش پیدا ہوا ہے اور ہر طرف سے اطمینان واعتماد اور خوشی کا اظہار کیا جارہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اکادمی میں کاموں کا نہایت خوشگوار تازہ ماحول بھی پروان چڑھ رہا ہے۔ واضح رہے کہ جناب مشتاق احمد نوری اس سے پہلے بھی اکادمی کی سکریٹری شپ سنبھال چکے اور اپنی بہترین صلاحیتوں سے نواز چکے ہیں اور انہوں نے ایک بار پھر یہ ذمہ داری، نئے اور تازہ عزائم کے ساتھ قبول کی ہے جس کے اثرات بروقت دیکھے جارہے ہیں۔

اردو لرننگ کورس کے طلبا وطالبات کے درمیان تقسیم اسناد

پٹنہ: گزشتہ دنوں بہاراردو اکادمی کے زیر اہتمام چلنے والے اردو لرننگ کورس کے ۵۱ویں بیچ کا اختتام ہوا۔ اس موقع پر جناب مشتاق احمد نوری سکریٹری بہاراردو اکادمی نے شرکا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ بچپن میں جب ہم اور آپ ہندی سیکھتے ہیں، اس وقت بھی اس زبان کے حروف تہجی یاد کرنے میں دس پندرہ دن اوسطاً لگ جاتے ہیں، حالاں کہ بچپن میں آدمی تیزی سے سیکھتا اور یاد کرتا ہے۔ اس اعتبار سے بڑی عمر میں آپ نے پندرہ دنوں تک وقت دیا اور ''اردو لرننگ کورس'' سے فائدہ اٹھایا، یہ بات اردو زبان کی طاقت اور اسے سیکھنے میں سہولت کا پتہ دیتی ہے۔ آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس شوق کو عملاً زندہ رکھیں اور تھوڑا سا وقت نکال کر اردو لکھنے اور اردو اخباروں کی سرخیاں پڑھنے کی مشق کرتے رہیں۔ اس طرح آپ کا اردو سے رشتہ تازہ رہے گا اور وہ مضبوط ہوتا جائے گا۔ مذکورہ بیچ کے کامیاب طلبا وطالبات کے درمیان، سکریٹری موصوف کے دست مبارک سے اسناد کی تقسیم بھی عمل میں آئی۔ واضح رہے کہ بہاراردو اکادمی نے غیر اردو داں حضرات کے لئے آموزش اردو کے پندرہ روزہ کورس کا اہتمام رکھا ہے جس سے شائقین بڑی تعداد میں مستفید ہورہے ہیں اور اس پروگرام کی مقبولیت آئے دن بڑھ رہی ہے۔

یوم آزادی کے موقع پر تقریب پرچم کشائی

پٹنہ: حسب روایت، یوم آزادی کے مبارک موقع پر، بہاراردو اکادمی کے احاطے میں، جناب مشتاق احمد نوری سکریٹری اکادمی کے دست مبارک سے پرچم کشائی کی رسم ادا ہوئی۔ اس موقع پر جناب سلطان اختر نائب صدر اکادمی، ممبر مجلس عاملہ جناب عابد نقوی اور جناب ناشاؔد اورنگ آبادی کے علاوہ، اکادمی کے عملے اور دیگر بیرونی حضرات نے شرکت کی۔ پرچم کشائی کے بعد حاضرین سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے جناب نوری نے کہا کہ آج کا دن ایک عظیم نعمت پانے کی یادوں کا دن ہے اور اسی کے ساتھ یہ دن اردو کی قوت بھی یاد دلاتا ہے، کیونکہ آزادی کی لڑائی اور اس کی تاریخ سے ''انقلاب زندہ باد'' کے نعرے کی تاثیر کبھی الگ نہیں کی جاسکتی۔

سلام و پیام

☆ ''زبان وادب'' کا ماہ اگست کا شمارہ اردو، فارسی وعربی زبان و ادب کے جید عالم معروف دانشور اور معلم سید ناصر حسین زیدی مرحوم سے متعلق ہے جو اپنے ظاہری و باطنی محاسن کی اعتبار سے منفرد اور ممتاز ہے۔ جناب ناصر زیدی صاحب ان باکمالوں میں تھے جنہوں نے علم وادب اور شعر وسخن کی شمع اپنی آخر سانس تک روشن رکھی۔ وہ ایک بڑے صحافی، ادیب، شاعر اور انشائیہ نگار تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بڑے بڑے ممتاز اور نمایاں شاگرد پیدا کئے جو ملک و بیرون علاقے میں پروقار عہدوں پر فائز ہیں اور علم وادب کی خدمات میں مصروف ہیں۔ بہار اردو اکادمی، پٹنہ نے موصوف پر خصوصی گوشہ نکال کر ان کی خدمات کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ توقع ہے کہ اس شمارے کی افادیت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے، اکادمی موجودہ فعال اور سرگرم سکریٹری کی ادارت میں آئندہ ایک خصوصی شمارہ بھی شائع کرے گی۔ تاہم گوشہ ناصر زیدی لائق ستائش بھی ہے اور قابل مطالعہ ومبارکباد بھی۔ اس شمارے میں جہاں جناب ناصر زیدی کی نثر وشاعری، ان کے اسالیب بیان، مطمح ادب، ان کی تحریر کے نمونے، ان کی کتابوں کے مجموعہ اور ان کی شخصیت کے گونا گوں پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں، وہیں پروفیسر عبدالصمد، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر اعجاز علی ارشد، پروفیسر کلیم الرحمٰن جیسے ناموران ادب کی تحریریں بھی شامل ہیں جن سے ناصر زیدی کی شخصیت اور فن کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ مذکورہ گوشہ کی اشاعت میں جہاں ''زبان وادب'' نے ادب نوازی کا ثبوت دیا ہے وہیں ناصر زیدی کے لائق و فائق شاگرد ڈاکٹر نسیم اختر نے اس گوشہ کے لئے مواد کی فراہمی اور اسے زیادہ سے زیادہ وقیع بنانے میں اپنا گراں قدر کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لئے وہ خصوصی طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس سے یہ بات بھی آشکارہ ہے کہ آج بھی نئی نسل اپنے اسلاف کے کارناموں کو زندہ وتابندہ رکھنے کے لئے ہمہ دم تیار ہے۔ ناصر زیدی کے فن اور شخصیت سے اردو دانوں کے روشناس کرنے کے لئے بہار اردو اکادمی، پٹنہ کو ایک سیمینار یا مذاکرہ کا انعقاد ضرور کرنا چاہئے۔ گوشہ کی پرکشش کمپوزنگ، خوبصورت طباعت اور دیدہ زیب سرورق باعث شکر اور قابل داد ہے، اس کے لئے اردو اکادمی کے جملہ ارکان شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ اکادمی کے موجودہ سکریٹری کی فعال قیادت میں ''زبان وادب'' کا شمارہ اپنے معیار کے آسمان کو چھوئے گا۔

محمد معیز الدین (بی۔اے۔ایس)

پرائیویٹ سکریٹری، وزیر محکمہ اقلیتی فلاح، حکومت بہار

☆ ''زبان وادب'' پابندی وقت کے ساتھ مل رہا ہے۔ مجلّہ کا تازہ شمارہ، اگست ۲۰۱۵ء سامنے ہے۔ مجھے کہنے دیجئے کہ اس شمارے کو ''یاد ناصر زیدی'' اور ''تبرکات ناصر'' کے خصوصی اوراق نے دستاویزی بنا دیا ہے۔ سید ناصر حسین زیدی بڑے ہی ذی علم آدمی تھے اور بیشک قدرت نے انہیں بہت سارے اوصاف حسنہ سے نوازا تھا۔ اس خصوصی گوشے کے تحت ایک طرف ان کی منتخب اردو و فارسی اور نثری وشعری باقیات، سرورق اور تحریروں کے عکس اور یادگار تصویریں سامنے آتی ہیں تو دوسری طرف ان کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر نہایت وقیع اور معلوماتی مضامین بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔ پروفیسر علیم اللہ حالی نے درست لکھا ہے کہ ''ناصر زیدی پارس پتھر تھے'' کہ معمولی لوہا بھی ان کے لمس سے سونا بنتا رہا۔ جناب عبدالصمد کی اس بات سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ بحیثیت معلم وہ ہماری تاریخ کے ایک روشن باب کا درجہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے ''کچھ ناصر زیدی کے بارے میں'' لکھتے ہوئے درحقیقت بہت کچھ لکھ دیا ہے اور کچھ اس طرح لکھ دیا ہے جو انہیں کا حصہ ہوسکتا تھا۔ ڈاکٹر امتیاز احمد، معین کوثر اور محمد اشرف عظیم آبادی نے بھی بہت پراثر اور معلوماتی

انداز سے ناصر حسین زیدی کی یادیں سپرد قرطاس کی ہیں۔ جناب محمد معیز الدین کا مقالہ ''ناصر حسین زیدی: باتیں اور یادیں'' خصوصیت سے قابل مطالعہ ہے جس میں انہوں نے جناب ناصر زیدی سے آخری ملاقات کی تفصیلیں لکھی ہیں اور جناب ناصر حسین زیدی جیسی نابغہ روزگار شخصیت پر اخلاص ومتانت کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ ڈاکٹر محسن رضا رضوی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ وہ انسان دوست، معلم، ماہر لسانیات، صحافی اور شاعر و ادیب غرض کہ کئی حیثیتوں سے ممتاز تھے۔ اس حصہ میں ڈاکٹر نسیم اختر کا مضمون بایں معنی خاص اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے ناصر صاحب کا مفصل سوانحی مطالعہ پیش کردیا ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر ریحان غنی نے ''الناصر'' کی خصوصی اشاعت کے حوالے سے ناصر زیدی کو جس طرح یاد کیا ہے اور جناب کلیم الرحمٰن نے ''ناصر زیدی: لہریں اور یادیں'' میں اپنے مخصوص انداز میں جو باتیں لکھی ہیں وہ بھی پڑھنے سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں۔ اس گوشہ کی بدولت یقیناً علمی حلقوں میں ''زبان وادب'' کا یہ شمارہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ رسالہ کے دیگر مشمولات ابھی زیر مطالعہ ہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا کہ ''بچوں کا زبان وادب'' کو بھی ناصر زیدی کی ''دعا'' سے محروم نہیں رہنے دیا۔ خدا کرے رسالے کا اشاعتی سلسلہ یوں ہی کامیابی کے ساتھ چلتا رہے۔ آمین!

ڈاکٹر شائستہ انجم نوری
صدر شعبہ اردو، ٹی پی ایس کالج، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' پابندی سے مل رہا ہے۔ اگست ۲۰۱۵ء کا شمارہ کل ہی موصول ہوا۔ ناصر زیدی یکتائے روزگار شخصیت کی یاد تازہ کرکے ''والیان زبان وادب'' نے بڑا کام کیا ہے۔ ابھی یہ شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ جولائی ۲۰۱۵ء کے شمارے میں میری غزل شائع ہوئی ہے جس کے لئے شکریہ!

صبا نقوی، مظفر پور

☆ ''زبان وادب'' (ج۳۶ش۸) یوم آزادی کی مبارکباد اور جناب سید ناصر حسین زیدی پر خصوصی گوشہ کے ساتھ ہم دست ہوا۔ ناصر زیدی بیشک بڑی ہی خوبیوں کے مالک تھے اور ''یاد ناصر زیدی'' کے تحت ان پر لکھنے والوں نے واقعی بڑے اخلاص اور انصاف واعتدال کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ آپ نے بھی بالکل بجا تحریر کیا ہے کہ ناصر صاحب مرحوم ومغفور ''استاد ہی نہیں استادگر شخصیت کے مالک تھے۔'' جناب اجمل فرید پر آپ کی تحریر ''کیا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور'' رخصت ہوجانے والے صحافی کے لئے بہترین خراج عقیدت کہی جائے گی۔ ''تحریک آزادی اور اردو شعرا'' پر ڈاکٹر رام داس نادار نے اچھا مواد یکجا کردیا ہے اور نیما یوشیج پر ڈاکٹر تنویر حسن کا مضمون یقیناً فارسی ادبیات کے طلبا وطالبات کے لئے خاصا مفید ہے۔ اسد رضوی نے اپنی غزل میں امکانات کی ایک دنیا سجائی ہے تو ہریندر گری شاد نے کرب والم سے بھرے مگر سچے عصری منظر نامے سامنے رکھ دئے ہیں۔ یہ تخلیقات دلوں کو چھولیتی ہیں۔ ''بچوں کے زبان وادب'' میں ڈاکٹر یاسمین پروین کا مضمون بہت اچھا اور معلوماتی ہے۔ خدا کرے رسالہ یوں ہی آگے بڑھتا رہے۔ آمین!

محمد رضوان، پٹنہ

☆ ''زبان وادب'' (ج۳۶ش۷) نظر نواز ہوا۔ عید کی مناسبت سے سرورق نہایت دیدہ زیب ہے۔ ''حرف آغاز'' کے تحت آپ کی تحریر متاثر کن اور دعوت فکر دینے والی ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی تحریر ''اردو میں طنز ومزاح نگاری'' واقعی قابل توجہ ہے اور ڈاکٹر انور ادیب نے حالی کی شخصیت پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ افسانوں میں مسرور تمنا کے علاوہ فخر الدین عارفی بھی متاثر کرتے ہیں۔ اس شمارے میں اختر شاہجہاں پوری کی غزل اور مجیب شہزر کی نظم دامن دل کھینچتی ہے۔

نفیس انصاری، سیتاپور (یوپی)

☆ ''زبان وادب'' (ج۳۶ش۷) زیر مطالعہ ہے۔ شمارہ صوری و معنوی دونوں اعتبار سے بہت خوب ہے۔ ''حرف آغاز'' کے تحت آپ متواتر اردو زبان وادب کے جن مسائل کو پیش کررہے ہیں

وہ قابل توجہ ہے۔ کاش ہم اردو والے ان مسائل کے حل کے لئے خود عمل کرتے۔ زیرِ نظر شمارے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون ''اردو میں طنز و مزاح نگاری'' اور ڈاکٹر نسیم اختر کا مضمون ''میتھلی کا پہلا شاعر: فضل الرحمٰن ہاشمی'' خاصا معلوماتی ہے۔ افسانوی حصے میں فخر الدین عارفی کا افسانہ ''منی پلانٹ'' اور ایم۔ رحمٰن کا افسانہ ''ضرورت'' تاثر چھوڑ جانے والی تخلیقات ہیں۔ ''منظومات'' میں شنکر کیموری کے ان اشعار نے بہت محظوظ کیا ۔

رحمت کی بہاروں میں سرکار چمکتے ہیں
جنت کے نظاروں میں سرکار چمکتے ہیں
جس آیت کو پڑھتا ہوں، آتے ہیں نظر آقا
قرآن کے پاروں میں سرکار چمکتے ہیں

''بچوں کے زبان وادب'' میں بھی معلوماتی مضامین اور منظوم کلام شامل کئے گئے ہیں۔ ''زبان وادب'' جون ۲۰۱۵ء میں آپ نے میرا مقالہ ''مولانا رضی الدین بھاگلپوری'' شائع کیا ہے، جس کے لئے میں بے حد ممنون ہوں۔

اسلام احمد شاہی، بھاگلپور

☆ ''زبان وادب'' (ج ۳۶ رش ۶) موصول ہوا، جس کے ذریعہ آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا اندازہ تو ہوا ہی ہے ساتھ ہی مختلف ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، جس کے لیے میں ذاتی طور پر آپ کا بیحد مشکور و ممنون ہوں۔ مجلّہ واقعی ادب کے حوالے سے معیاری ہے جس میں آپ کی محنت کو مکمل دخل ہے۔ افسانہ کے حوالے سے علی احمد فاطمی کا مضمون، مثنوی کے حوالے سے مناظر احسن گیلانی اور مثنوی خواب وطن کا تجزیاتی مطالعہ اور شفق کے افسانوں پر ایم نسیم اعظمی کا مضمون شفق کو کامیاب افسانہ نگار قرار دیتا ہے، وہیں اختر اورینوی صاحب پر انوار محمد عظیم آبادی کا مضمون پوری طرح اپنی جانب متوجہ کرتا ہے۔ آپ نے اردو قاری کو جاپانی شعری صنف ''رینگا'' سے متعارف بھی کرایا، اس کے لئے آپ کے ساتھ سہیل ارشد بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہندوستان میں صحافت کا آغاز، حفیظ میرٹھی کی شاعری، مولانا رضی الدین بھاگلپوری پر مضمون اور ''پنڈت دتاتریہ کیفی: ایک مطالعہ'' خاصے کے مضامین ہیں جو قاری کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہیں۔ مراق مرزا کا افسانہ ''فکر کا صحرا'' ایک خوبصورت افسانہ ہے جو آج کی سماجی زندگی پر ایسا طمانچہ ہے، جس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ اس افسانے کا اختتامیہ دل دہلا دینے والا ہے۔ معین الدین عثمانی اور محمد ذاکر، عاصمہ صدیقی، احمد ندیم کی کہانیاں بھی خوبصورت کہانیاں ہیں۔ شعری حصہ میں فراغ روہوی، شاہد اختر اور سلیم انصاری کے بعض اشعار دامن دل کھینچتے نظر آتے ہیں۔ ''کتابوں کی دنیا'' کے ذریعہ نئی کتابوں کا مطالعہ بھی خوب ہے۔

ذکی طارق، غازی آباد، یوپی

قلم کار حضرات توجہ دیں

اپنی تخلیقات کے ساتھ بینک اکاؤنٹ میں آپ کا جو نام ہے اسے صاف صاف انگریزی میں لازمی طور پر تحریر کریں اور ساتھ ساتھ اپنی تصویر اور اپنا پتہ بھی انگریزی میں پن کوڈ کے ساتھ لکھیں۔

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سرٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔ اگر رجسٹرڈ پوسٹ سے رسالہ منگانا چاہتے ہوں تو اس کے لئے زر سالانہ ۳۵۰ روپے ہوگا۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ اگر اگلے سال کا زر سالانہ آپ سے موصول نہیں ہوا تو یہ سمجھا جائے گا کہ آپ آگے خریدار بنے رہنا نہیں چاہتے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان وادب

☆	روشنی کی باتیں	ناوکؔ حمزہ پوری	۷۴
☆	ماں کی بارگاہ میں	قیصرؔ صدیقی	۷۴
☆	''کوّا قوم'' کے نام	غزالہ پرویز	۷۵
☆	عیدقرباں کا پیغام	شرف الہدیٰ	۷۶
☆	اردو	ثناء اللہ ثناؔ دوگھروی	۷۷
☆	پیغام	پرویز اشرفی	۷۸
☆	عبدالکلام کی انمول باتیں	ماریہ نسیم	۷۹
☆	یادرکھوتم	خالدرحیم	۸۰
☆	دعا	کرشن پرویزؔ	۸۰

ناوکؔ حمزہ پوری

دارالادب،حمزہ پور،پوسٹ شیر گھاٹی،ضلع گیا 824211

روشنی کی باتیں

ہماری باتیں نہیں ہیں دل کی گڑھی ہوئی شاعری کی باتیں
ہماری باتوں میں ہیں نہاں بس خدا کی باتیں نبیؐ کی باتیں

تو اس میں کیا ہے عجیب اگر ہیں زباں پہ ہر دم نبیؐ کی باتیں
بسا ہوا جو بھی دل میں ہوگا زباں پہ ہوں گی اسی کی باتیں

ہے نور اسلام سے منور چہار یارِ نبیؐ کی باتیں
ہو قول ابوبکرؓ یا عمرؓ کا کہ وہ ہوں عثمانؓ ،علیؓ کی باتیں

خدا نے فرما دیا کہ برحق ہے دین اسلام ہی ہمارا
یہ لازمی ہے کہ ہو ہمارے عمل سے روشن اسی کی باتیں

بھلا اندھیرے میں یوں بھٹکتے رہو گے کب تک عزیزو آؤ
بس ایک اسلام کی زباں پر ہیں بے گماں روشنی کی باتیں

اب اور کب تک غزل و زل میں گنوائیں عمر دو روزہ ہمدم
جو سانس دو سانس زندگی ہے تو کیوں نہ ہوں زندگی کی باتیں

یہ شعر ناوکؔ کے سن کے ارباب عقل و دانش پکار اٹھے
جو سننا چاہے وہ شخص سن لے لگا کے دل جنتی کی باتیں

❀❀❀

قیصرؔ صدیقی

Vill. Qaisar Abad Nawada, P.o. Kheraj Jitwa
Samastipur 848134

ماں کی بارگاہ میں

میری ماں ، تیری عظمت پہ لاکھوں سلام
تیری معصوم صورت پہ لاکھوں سلام
تیری چاہت پہ ، شفقت پہ لاکھوں سلام
سایۂ ابر رحمت پہ لاکھوں سلام
جس لہو نے عطا کی مجھے زندگی
اس لہو کی حرارت پہ لاکھوں سلام
اے دلِ ہاجرہ اے فصیحی ضیا
تیرے فہم و فراست پہ لاکھوں سلام
آج تک یاد ہے ہم کو تیرا سبق
درسِ صبر و قناعت پہ لاکھوں سلام
تو کہ اک پیکر نغمہ و شعر تھی
تیری گل پوش فطرت پہ لاکھوں سلام
میری نظروں میں ہے ، تیرا حسن نظر
اس ادائے بصیرت پہ لاکھوں سلام
پیار کی ایسی کوئی بھی مورت نہیں
اس جمالِ صداقت پہ لاکھوں سلام
ہوگئے چور خوابوں کے سب آئینے
تیری ناکام حسرت پہ لاکھوں سلام
ہم کو قیصرؔ جو ماں کی دعا سے ملی
اس محبت کی جنت پہ لاکھوں سلام

❀❀❀

غزالہ پرویز

C-177, Block D, Shahra-e-Noor Jahan, North Nazimabad
Karachi 74700 (Pakistan)

''کوّا قوم'' کے نام

میں نے اپنے گھر کے ایک کونے میں کچھ کونڈے رکھ چھوڑے ہیں پانی اور دانے کے۔ یہ کونا میرے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتا ہے اور میں گھنٹوں کھڑکی میں کھڑی دیکھتی رہتی ہوں۔ خوفزدہ چڑیائیں، سہمی کبوتریں، ڈری ڈری فاختائیں، مینائیں، دلیر اور نڈر کوے اور کبھی کبھی کوئی پیاسی چیل...... پہلے اتریں گے منڈیر پر، طائرانہ نظر ادھر اور اُدھر، پھر کوزے پہ، جلدی جلدی چکتے جانا، خوفزدہ نظروں سے جائزہ بھی لیتے جانا اور ہلکی سی کھٹ یا دھیمی سی ٹھک......اور......پھر......کبھی کبھی تاک میں دھاک لگائے بیٹھی بلی...... آسان شکار گھبرائی ہوئی کبوتریں...... ایک لمحہ...... اور ایک پھڑ پھڑاتی کبوتر پنجے میں، خوف سے بند آنکھیں اور پھر سارے کبوتر غائب......ایک دو دنوں کے لئے سنسان کونا، انتظار کرتے کوزے اور میری اداس آنکھیں اور پھر وہی ڈرتی، جھجھکتی پیاسی کبوتروں کی آمد۔

میں اکثر سوچتی اگر ساری کبوتریں اکھٹے جھپٹ پڑیں تو، بلّی کو بھاگتے ہی بنے گی یا کوئی بلی کوے یا چیل کو پکڑ کے تو دکھائے۔

آج گھر کے پچھواڑے صبح صبح اس قدر بلند آواز، اتنا شور ''کاں، کاں، کاں'' کہ الاماں، الحفیظ۔

پیچھے بھاگی، دیکھا تو درخت کے گھونسلے سے ایک کوے کا بچہ نیچے گر پڑا تھا اور شامت کی ماری بلی نے پنجے میں دبانا چاہا۔

جانے کہاں سے سو سے زائد کوے امنڈ آئے تھے، چھت، درخت، منڈیر اور زمین کوؤں سے بھر گئی تھی۔

''کاں کاں'' کرتے کوے......یقین نہیں آرہا تھا کہ سب یہاں کے باسی ہیں، کیونکہ دیکھا ہی نہیں تھا اتنے سارے اکھٹے۔

میں سکتے میں کھڑی دیکھتی رہی۔ کوئی کوا بلی کے سر پر ٹھونگیں مارتا، تو کوئی دم پہ چونچ، چہار اطراف سے سب نے بلی کو گھیرا ہوا تھا اور وہ شیر کی خالہ چاہ کر بھی بھاگ نہیں پا رہی تھی۔ اتنے ٹھونگوں سے وہ مکمل زخمی ہو چکی تھی اور کوے کا بچہ سہما کونے میں جس کے گرد گھیرا ڈالے باقی کوے۔ شور اس قدر بپا کئے، اپنی قوم کو آوازیں دیتے، سب نے باری باری اپنے اپنے حصے کی ٹھونگیں مار مار کر بلی کو لہولہان کر دیا تھا۔

ایک گھنٹے میں بلی بے سدھ پڑی تھی اور بچہ آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی اڑان بھرتا جنگلے پہ، جنگلے سے منڈیر پہ اور منڈیر سے درخت پر......کیا ہم ''کوّا قوم'' بھی نہیں بن سکتے؟

پیغام

(ص۷۸ سے آگے)

''پاپا! اگر ہم آپ کی اور امی کی بات مانیں اور شرارت نہ کریں تو ڈراؤنے خواب تو نہیں آئیں گے؟'' عظیم نے پوچھا۔

''جو بچے اپنے والدین کا کہنا مانتے ہیں، انہیں جھڑکتے نہیں ہیں، ان کی عزت کرتے ہیں، انہیں اچھے خواب آتے ہیں۔''

والد نے جواب دیا۔ والد کے جواب سے عظیم کو راحت ملی اور وہ اتنا متاثر ہوا کہ اس نے فوراً اللہ سے توبہ کر لی اور اپنے پاپا اور امی سے سچے دل سے معافی مانگ لی۔

رات ہو چکی تھی۔ عظیم گہری نیند میں سو رہا تھا۔ اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک خوبصورت باغ میں نہایت حسین پری اسے جھولا جھلا رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ تم نے سچے دل سے توبہ کر لی اور اپنے ماں باپ کی عزت کرنے کا وعدہ کیا تو اللہ نے تمہیں یہ انعام دیا ہے۔ صبح جب آنکھ کھلی تو عظیم کا سر بہت ہلکا محسوس ہوا اور ناشتہ کر کے امی و پاپا کو سلام کرتے ہوئے خوشی خوشی اسکول کے لئے روانہ ہو گیا۔

شرف الہدیٰ
روزنامہ ’’سنگم‘‘ پٹنہ

عید قرباں کا پیغام

عید قرباں یا عیدالاضحیٰ ایک عظیم عالمی تہوار ہے اور اس کا تعلق انبیائے کرام کی تاریخ سے ہے۔ ہر سال ماہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو مسلمانانِ عالم اپنے معبود کی خوشنودی اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے عید قرباں مناتے ہیں۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ مومن کے لئے دنیا میں تین عیدیں ہیں۔ ایک عید ہر ہفتے ایک بار آتی ہے اور بقیہ دو عیدیں ایسی ہیں جو سال میں صرف ایک بار آتی ہیں، ہر ہفتے آنے والی عید جمعہ کا دن قرار دیا گیا ہے اور وہ عیدیں جو سال میں صرف ایک بار ہی آتی ہیں، عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ ہیں۔ عیدالفطر رمضان المبارک کے بعد آتی ہے اور عیدالاضحیٰ اسلامی سال کے آخری مہینے کی دس تاریخ کو منائی جاتی ہے۔ اس عید کی بڑی ہی اہمیت اور فضیلت ہے۔

عید قرباں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یاد میں منائی جاتی ہے، جنہوں نے اپنے لخت جگر کو خدا کے حکم پر قربان کرنے کی ہنستے ہنستے رضامندی بھر دی اور خدا کی خوشنودی کے لئے وہ سعادت مند فرزند بھی خندہ پیشانی کے ساتھ قربان ہونے کے لئے تیار ہو گیا، مگر خدائے تعالیٰ کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان مقصود تھا، لہٰذا وہ اس سخت آزمائش میں کامیاب وکامراں ٹھہرے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ جنت سے دنبہ بھیجا گیا اور وہ ذبح ہوا۔

بیشک اللہ تعالیٰ کے تقرب کے لئے قربانی کا عمل نہایت پسندیدہ ہے۔ یہ دن اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے افضل اور بہترین دن ہے۔ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا اخلاص، سچائی، قربت اور جذبہ ایثار پسند آتا ہے اور وہ اسے قبولیت سے نوازتا ہے۔

مخصوص جانوروں کو مخصوص دنوں میں یعنی دسویں ذی الحجہ سے بارہویں ذی الحجہ تک تقرب الٰہی اور ثواب کی نیت سے ذبح کرنے کا نام قربانی کا فرض ادا کرنا ہے۔ اس کے بارے میں جب صحابہ کرام نے پوچھا کہ یہ قربانی کیا ہے؟ تو اللہ کے نبی نے فرمایا کہ یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔

قربانی ایک اہم مالی عبادت ہے۔ حضور نے ارشاد فرمایا کہ یوم النحر (دسویں ذی الحجہ) میں ابن آدم کا کوئی عمل خدا کے نزدیک خون بہانے (قربانی کرنے) سے زیادہ پیارا نہیں، قربانی کا جانور قیامت کے دن اپنے سینگ، بال اور کھروں کے ساتھ آئے گا اور قربانی کا خون زمین پر گرنے سے قبل مقبول ہو جاتا ہے۔ اس سے قربانی کے عمل کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے کہ سبھی عبادت ادائیگی کے بعد قبول ہوتی ہے اور یہ ادائیگی کے ارادے کے ساتھ ہی قبول کر لی جاتی ہے۔

عید قرباں کے دن جانوروں کی قربانی اصل میں ایک علامت ہے اور ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس عمل کی دینی اہمیت اپنی جگہ، لیکن جب ہم قربانی اور ایثار کے جذبے سے کام لیتے ہیں تو دنیا کی زندگی میں بھی ہمیں بڑے فائدے ملتے ہیں۔ وقت اور خواہشوں کی قربانی تو آدمی کو بچپن سے بڑھاپے تک قدم قدم پر دینی پڑتی ہے۔ تب ہی وہ تعلیم، ملازمت، کاروبار، دوستی محبت اور دوسرے نیک مقاصد میں کامیابی پاتا ہے۔ ہم میں اپنے اندر دوسروں کی بھلائی کے لئے قربانی کا جذبہ پیدا کرنا چاہئے اور اسے ہمیشہ تازہ رکھنا چاہئے، یہی اصل میں عید قرباں کا پیغام ہے۔ اس تہوار کا مقصد گوشت کھانا نہیں، بلکہ ہر طرح غریبوں اور رشتہ داروں کی ضرورتوں کا خیال رکھنا اور ان کے لئے اپنے اندر نیکی وقربانی کے جذبے جگانا ہے۔

ثناءاللہ ثنؔا دوگھروی

C/o Book Emporium, Sabzibagh, Patna 800004

اردو

صبح ہے روشن ، شام سہانی ہے اردو
فصل گل کی شوخ جوانی ہے اردو

زلف لب و رخسار کی ہے خوشبو اس میں
حسن کا پیکر مشک فشانی ہے اردو

شاخ بدن کا لوچ ، تبسم کلیوں کا
حسن کی اک جلوہ سامانی ہے اردو

پیہ پپیہے کی ہے ، کوک ہے کوئل کی
اور بلبل کی خوش الحانی ہے اردو

بزم شعر و سخن کی جوانی ہے اس سے
دن کا کنول ہے رات کی رانی ہے اردو

دیر و حرم تک اس کی رسائی کیا کہنا
صوفی ، سنت کی میٹھی وانی ہے اردو

فلسفہ اقبؔال و غالبؔ ہے اس میں
میرؔ کا جادو حسن معانی ہے اردو

سوؔدا اور انیسؔ کا طرز بھی دلکش ہے
میر حسنؔ کی سحر بیانی ہے اردو

پریم ، کرشن ، شرر ، شبلی و حالی کی
طرز ادا ہے ایک کہانی ہے اردو

بے معنی ہیں سارے نشیب و فراز یہاں
دریا کی موجوں کی روانی ہے اردو

اب بھی راج دلوں پہ اس کا ہے قائم
صدیوں جس نے کی سلطانی ہے اردو

ایرانی ، افغانی اور نہ تورانی ہے
گھر بھارت ہے ہندوستانی ہے اردو

صبح بنارس ، شام اودھ کی یہ مظہر
اور گنگا کا میٹھا پانی ہے اردو

الفت کا نغمہ ہے پیار کی سرگم ہے
نفرت سے بالکل انجانی ہے اردو

گرچہ سارے جگ میں ہیں جلوے اس کے
اپنے گھر میں ہی بیگانی ہے اردو

جیسے ندیاں آکر ملتیں ساگر میں
یوں رکھتی وسعت دامانی ہے اردو

روشن ہے ، رخشاں ہے مستقبل اس کا
خود مستقبل کی تابانی ہے اردو

❀❀❀

پرویز اشرفی
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi 110025

پیغام

صبح ناشتے کی میز پر عظیم خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے والد رات کی ڈیوٹی مکمل کر کے ابھی ابھی آئے تھے۔ ''کیا بات ہے عظیم، اتنے خاموش کیوں ہو اور پریشان بھی لگ رہے ہو؟''

''نہیں پاپا! ایسی کوئی بات نہیں'' وہ آہستہ سے بولا۔

''آخر تمہاری خاموشی کا کوئی تو سبب ہوگا۔ اس سے پہلے تو تم بہت طوفان بدتمیزیاں کرتے تھے؟'' والد نے پوچھا۔

''بات یہ ہے پاپا کہ رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بھیانک شکل وصورت کا آدمی جس کا منھ گھوڑے کی طرح لمبا ہے، سر پر دو بڑے بڑے سفید سینگ ہیں، ہاتھ میں بڑے بڑے نو کیلے ناخن، وہ مجھے زنجیروں میں جکڑ کر آگ کے دریا میں گھسیٹتا ہوا لے جا رہا ہے۔ میں چیخ رہا ہوں 'مجھے چھوڑ دو' لیکن اس کی گرفت بہت سخت تھی اور اس نے مجھے دہکتی آگ کے گڑھے میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ مجھے پیاس کی شدت محسوس ہوئی۔ میں نے جب پانی مانگا تو اس نے ایک کھوپڑی میں کھولتا ہوا پانی اور زخم سے نکلا مواد ملا کر پینے کو دیا۔ 'یہ کیا یہ تو ناپاک پانی ہے، میں اسے نہیں پی سکتا' تو اس نے گرجدار آواز میں کہا: 'بے وقوف انسان! ماں باپ سے ناروا سلوک کرنے والوں اور نافرمانی کرنے والوں کو یہی پینا پڑتا ہے۔ 'پیو، پیو۔'' وہ اس طرح چیخ رہا تھا کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ آنکھ کھلی تو میں اپنے بستر کے نیچے پڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ خواب، خواب ہوتے ہیں۔ پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ اللہ نے خواب کے ذریعے تمہیں کوئی پیغام دیا ہے۔ اسکول سے واپس آکر مجھ سے ملنا، میں تمہیں والدین کی عزت کے بارے میں کچھ باتیں بتاؤں گا۔'' والد نے تسلی دی۔

عظیم اسکول سے آنے کے بعد فریش ہوا، ہلکا ناشتہ کر کے اپنے پاپا کے پاس گیا۔ انہوں نے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا: ''میرے بچے! ماں باپ ایسی ہستی ہیں جن کی عزت کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ماں کے قدموں کے نیچے جنت بنائی ہے اور کہا ہے کہ جب ماں باپ بڑھاپے کو پہنچیں تو انہیں 'اف' بھی نہ کہو۔ ہمارے بزرگوں نے ماں باپ کی عزت کی ہے۔ میں تمہیں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک عزیز دوست اور صحابی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ سناتا ہوں۔''

حضرت ابوبکر صدیق کی ایک عادت تھی کہ وہ جب کبھی کسی غلام پر ظلم ہوتے یا اسے زنجیروں میں بندھا ہوا دیکھتے تو اسے خرید لیتے، پھر اسے آزاد کر دیتے تھے۔ اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق نے، حضرت بلال کو ان کے آقا سے ایک چادر اور کچھ غلہ کے عوض خرید کر آزاد کر دیا تھا۔ جب کوئی ضعیف عورت، لونڈی، بوڑھا مرد اسلام قبول کر لیتا تو آپ اسے خرید کر آزاد کر دیتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق کے والد قحافہ جو ابھی اسلام کے دائرے میں نہیں آئے تھے، یہ سب دیکھ کر کہنے لگے:

''ابوبکر! میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور اور معذور، ضعیف عورتوں کو خرید کر آزاد کر رہے ہو۔ اس کے بجائے اگر مضبوط و تندرست جوانوں کو خرید کر آزاد کرو تو بہتر ہے تاکہ وہ تمہارے ساتھ رہیں اور ضرورت پڑنے پر تمہارے دشمنوں کے مقابلہ میں ہوں۔''

حضرت ابوبکر صدیق نے مؤدبانہ انداز میں عرض کیا:

''والد محترم! مجھے تو صرف اللہ کی خوشنودی درکار ہے۔''

''میرے بیٹے! ایسے اسلاف کی زندگی ہمارے لئے نمونہ ہیں۔ ہمیں تو ان کی تقلید کرنی چاہئے۔ حضرت ابوبکر چاہتے تو والد محترم کو سخت لہجہ میں جواب دے سکتے تھے، لیکن آپ نے بڑے صبر و تحمل سے والد کی بات سنی اور پھر مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔''

''ایسا کیوں پاپا'' عظیم نے پوچھا۔

''اس لئے کہ حضرت ابوبکر صدیق ماں باپ کا مرتبہ جانتے تھے اور انہیں معلوم تھا کہ ماں اور باپ کی عزت کس طرح کی جاتی ہے۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمیں بھی ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے ماں باپ کی عزت کرنی چاہئے۔'' والد نے جواب دیا۔

(بقیہ ۷۵ پر)

ماریہ نسیم
نزد غنیمت اپارٹمنٹ، این۔ بی روڈ، پٹنہ سیٹی 800008

عبدالکلام کی انمول باتیں

ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام کا ستائیس جولائی ۲۰۱۵ کو انتقال ہوگیا۔ وہ اس وقت I.I.M. شیلانگ میں لکچر دے رہے تھے۔ اسی وقت ان پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ ان کی پیدائش پندرہ اکتوبر ۱۹۳۱ کو تمل ناڈو کے کامیشورم میں ایک ماہی گھرانے میں ہوئی تھی۔ زندگی کے نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے انہوں نے کامیابیوں کے آسمان چھوئے۔ ''ترشول'' اور ''اگنی'' جیسے میزائل کے خالق عبدالکلام ''میزائل مین'' کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کا ایک خفیہ نام جنرل میجر پرتھوی راج بھی تھا۔ ڈاکٹر عبدالکلام نے سال ۱۹۶۲ میں ہندوستانی خلائی تحقیقاتی ادارہ (ISRO) جوائن کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہمارا ملک دفاع کے معاملہ میں خودکفیل اور مضبوط رہے اور نت نئے جدید اسلحہ اور آلات ہوں۔ ان کے گراں قدر سائنسی، علمی، دفاعی، تحقیقاتی ودیگر شعبوں کی خدمات کے صلے میں ۱۹۹۰ میں انہیں "پدم ویبھوشن" اور ۱۹۹۷ میں ملک کے سب سے بڑے اعزاز ''دیش رتن'' سے نوازا گیا۔ وہ یقیناً ہمارے ملک کے رتن، انمول رتن تھے۔

ہمارے لئے ان کی زندگی میں بے پناہ سبق ہے۔ وہ بیک وقت ایک عظیم سائنس داں، دفاع اور زراعت کے شعبہ کے ماہر، بے نظیر مفکر اور بے مثل فلسفی اور ادیب تھے۔ صدر جمہوریہ ہند (۲۰۰۲-۰۷) رہتے ہوئے بھی انہوں نے خودکو ایک ٹیچر کی حیثیت سے ہمیشہ پیش کیا۔ وہ بڑوں کے ساتھ بچوں کے نایاب اور کامیاب استاد تھے، جن کی تعلیمات کی روشنی میں ہم زندگی کی کٹھن اور دشوار منزل کو آسانی سے طے کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالاکلام نے سائنس سے لے کر فلسفہ تک کئی کتابیں لکھیں۔ ملک میں گھوم گھوم کر لوگوں کو پڑھاتے رہے اور بچوں کے حوصلے بڑھاتے رہے۔ وہ ان سے خود ملتے اور ان کے اندر حوصلہ، جوش اور جذبہ بھرتے۔ وہ ہندوستان کی غربت اور جہالت کو ختم کر کے اسے دنیا کا عظیم ترین ملک بنانا چاہتے تھے۔ خود ان کی زندگی بہت سادہ تھی۔ لوگ ان سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے۔ اگرچہ ان کے بے شمار اقوال ہیں، مگر ان میں چند وہ ہیں جو ہمارے لئے مشعل راہ ہیں:

(۱) ایک اچھی کتاب ایک سو اچھے دوستوں کی طرح ہے اور ایک اچھا دوست ایک لائبریری کے مانند ہے۔

(۲) اگر آپ اپنے کام کے تئیں مخلص ہیں تو آپ کو کسی کی سلامی بجالانے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر آپ اپنے کام میں مستعد نہیں ہیں تو آپ کو ہر ایک کی سلامی بجالانے کی ضرورت پڑے گی۔

(۳) خواب وہ نہیں ہے جو آپ نیند کی حالت میں دیکھتے ہیں۔ خواب وہ ہے جو آپ کو سونے نہیں دیتا۔

(۴) آپ اپنے کام سے پیار کریں، کمپنی سے نہیں کیونکہ آپ نہیں جانتے ہیں کہ کب کمپنی آپ کو کام سے الگ کردے۔

(۵) جب آپ کسی عظیم مقصد، کسی غیر معمولی عمل سے حوصلہ حاصل کرتے ہیں تو آپ کے خیالات اپنی سرحدیں توڑ دیتے ہیں۔ آپ کی پوشیدہ قوتیں، صلاحیتیں اور لیاقتیں فعال ہوجاتی ہیں اور آپ خود کو اتنا عظیم سمجھنے لگتے ہیں، جتنا آپ نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔

یہ اور اس طرح کے اقوال ہماری زندگی میں انقلاب لانے کے ساتھ ہمارے ملک ہندوستان کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

خالد رحیم

Khansama Lane, Manisahu Chowk
Buxi Bazar, Cuttack 753001 (Odisha)

یاد رکھو تم

غور سے میری بات سنو تم
اور ہمیشہ یاد رکھو تم
نیک بنو ، اچھے کہلاؤ
سچ بولو ، سچے کہلاؤ
سچائی کا ساتھ نبھاؤ
ہرگز جھوٹ کے پاس نہ جاؤ
سچے کو ملتی ہے عزت
جھوٹوں کے حصے میں ذلت
سچ سے ہے مضبوط ارادہ
سچ کرتا ہے پورا وعدہ
سچ سے سر اونچا رہتا ہے
جھوٹا شرمندہ رہتا ہے
جو سچ بولے جنت پائے
جھوٹ جہنم تک لے جائے
سچ کہنے کی عادت ڈالو
تم رب کی خوشنودی پالو

کرشن پرویؔز

Kharar, Distt Mohali 140301 (Pb.)

دعا

خدایا ملے علم کی روشنی
منور ہو اس سے مری زندگی

چلوں نیک رستے پہ میں عمر بھر
ہو اپنی کمائی پہ مری گزر

جہاں میں سبھی سے ملوں پیار سے
نہ چھوٹا کروں دل کبھی ہار سے

بدی سے بچوں میں ، بھلائی کروں
نہیں بھول کر بھی برائی کروں

یہ توفیق دینا مجھے اے خدا
کروں فرض دنیا میں اپنا ادا

نہ دوئی کا جذبہ کبھی دل میں ہو
سنبھالوں اسے جو بھی مشکل میں ہو

یہی بس ہے پروؔیز کی آرزو
ترا جلوہ مجھ کو ملے چار سو